PK
2199
A4A16
1914

Idarah - i Adabiyat - i Delli
2009, Qasim Jan St.,
Delhi-6 (India)

قومی زندگی۔ قومی نشو ونما کیلئے اتحاد کرنا ہم سب کا فرض

اور

الٰہی مرضی ہے

مُفت

ہندو مسلمانوں کی باہمی اتحاد و اتفاق کی کتاب

ایک محب وطن کی قوموں کی یگانگت و یکجہتی کے عالمگیر

مذہب پر سچی اور پُر تاثیر واجب العمل ہدایات و نصائح

آدھ آنہ کا ٹکٹ بھیج کر پتہ ذیل سے طلب کرو

شیخ ضیاء الحق سابق اڈیٹر پیشوا | لاہور چوک متی

کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں، اور اسی پر قناعت کرتے ہیں، اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اُسوقت ہوگی، جبکہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہونگے، اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائینگے، فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کا تاج سر پر، یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی ہے ، اے دوستو میں خود بھی اُن ہی میں ہوں، کیونکہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے، ہم آدمی جبھی بنیں گے، جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۰۹)

(۳۷۵) پس جو میرا گناہ ہے وہ بجز اپنے ہموطنوں کی عموماً اور اسلام کی خصوصاً خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ~ نیست یاران طریقت غیر ازیں تقصیر ما ٭ ٭ اگرچہ میری اس دلسوزی کو میرے ہموطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ اُلٹا سمجھا اور کوئی الزام اور عیب اور برائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی کہ علانیہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی ہو، مگر جو کہ میری یہ دلسوزی اپنے ہموطنوں سے یا ہمقوموں سے کسی صلہ کی توقع پر نہ تھی بلکہ اس کا اجر خدا سے لینا ہے اسلئے میرے ہموطنوں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی مجھ کو ناگوار نہیں گذری۔ اور خدا نے مجھ کو اپنے ارادہ پر مستحکم رکھا، ٭ ٭ نہ پرانے دوستوں کی باتیں بُری معلوم ہوتی ہیں، نہ نئے شفیقوں کی تشنیع رنج دیتی ہے، عام بھلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی والحمد للّٰہ علیٰ ذالک۔ (ایضاً حصہ ۲۔ صفحہ ۲۷۴)

(۳۷۶) جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانیوالی ہے، وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے جبتک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہونگے، ہم ذلیل رہینگے، اوروں سے پست رہینگے، اور اس عزت کو نہ پہنچینگے جسپر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے، یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے تم کو کہیں ہیں، مجھے اسکی کچھ پروا نہیں ہے، کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ، میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ اُن سے کہدوں، اور اپنا فرض ادا کروں، اور خدا کے سامنے۔ جو قادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو دھو دوں۔

(ایضاً۔ صفحہ ۱۳۱)

پہنچ جائے، تو گوارا ہے۔ (حیات جاوید حصہ ا صفحہ ۸۹)

(۳۷۱) اگر خدا کی مرضی ہے تو ہم سب کچھ کریں گے، اگر زندہ ہیں، اور خدا کو بھی منظور ہے، تو اپنے مخالفوں کو دکھائیں گے کہ خدا نے کیا کیا، اور اگر اس میں آنکھ بند ہوگئی اور لحد میں جا سوئے، تو یہ امید رکھیں گے کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"۔ (ایضاً صفحہ ۱۷۹)

(۳۷۲) کون ہے جو آج مجھ کو اس اسٹیج پر دیکھکر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اُس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کیلئے نیک نیتی سے کئے جائیں، ان کو بے عزتی کا کام سمجھیں، آہ اُس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کیلئے مکر و پندار کے کالے سوت سے بُنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے مُنہ پر ڈالے ہوئے ہوں، مگر اپنی بدصورتی اور دل کی بُرائی کا کچھ علاج نہ سوچیں، آہ اُس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے، اپنے گھر میں کھُلے خزانے ایسی بے شرمی اور بیحیائی کے کام کرے، جن سے بیشرمی و بے حیائی بھی شرما جائے، لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم و نفرین کا کام سمجھے۔ (ایضاً صفحہ ۲۰۳)

(۳۷۳) خیال کیا جاتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہ کی، تاوقتیکہ وہ علم خود اُس ملک کی زبان میں نہ آگیا ہو، مگر اس دلیل میں ایک بڑے جزو کو جسے اُس کی جان کہنا چاہئے، چھوڑ دیا گیا ہے، درحقیقت نہایت موزونیت کیساتھ یوں کہا جا سکتا ہے، کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی، تاوقتیکہ وہ علم اُس زبان میں نہ آگیا ہو، جو اُس ملک پر حکمران ہے، ہندوستان میں جو زبان حکمران ہے، وہ ورنیکلر نہیں ہے بلکہ انگریزی زبان ہے، اسلئے اس ملک میں ورنیکلر کے ذریعہ سے کسی علم کو ترقی نہیں ہوسکتی، تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو، کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۷)

(۳۷۴) یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے، ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اُسکے ہاتھ بکے ہوئے ہیں، جو ٹکڑا ٹیرا علم کا وہ دیتی ہے، اُسی کو

کے دل کو سیاہ اور اُس کے دماغ اور عقل کو کُند اور خراب کر دیتی ہے۔ (الیضاً صفحہ ۱۷۱)

(۳۶۸) مذہب شیعہ امامیہ کا نہایت صحیح اور سچا مسئلہ ہے۔ کہ ہر زمانہ میں مجتہد کا ہونا ضرور ہے کوئی زمانہ مجتہد العصر سے خالی نہیں ہوتا۔ (الیضاً صفحہ ۱۸۲)

(۳۶۹) اُن غلط قصوں میں سے جو مسلمانوں کے ہاں مشہور ہیں۔ ایک قصہ امام مہدی آخر الزمان کے پیدا ہونے کا ہے۔ اِس قصہ کی بہت سی حدیثیں کتب احادیث میں بھی مذکور ہیں۔ مگر کچھ شبہ نہیں۔ کہ سب جھوٹی اور مصنوعی ہیں۔ جبکہ ایک محقق کیا باعتبار واقعاتِ تاریخی اور کیا باعتبار اُن کے راویوں کے اُن پر غور کرتا ہے۔ تو اُن کا غلط اور نامعتبر اور وضعی ہونا آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات بھی کھل جاتی ہے۔ کہ اِن حدیثوں کے بنانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ . . . . مہدی آخر الزماں کی بشارت کوئی اصلی بشارت نہ تھی۔ بلکہ اُس زمانہ کے لوگوں کی صرف ایک حکمت عملی اور خلافت ہاتھ آ جانے کی تدبیروں میں سے ایک تدبیر تھی۔ اور اُن سے کسی ایسے مہدی کی جو مسلمانوں نے تصور کر رکھا ہے۔ اور جس کا قیامت کے قریب ہونا خیال کیا ہے بشارت مقصود نہیں تھی۔ مگر جبکہ عام لوگوں نے دیکھا۔ کہ جن لوگوں نے مہدیت کا دعوے کیا۔ اُن کے آنے سے دنیا میں وہ تبدیلیاں واقع نہیں ہوئیں۔ جن کے ہونے کی وہ توقع کرتے تھے۔ اُنہوں نے مہدی موعود کا آنا دنیا کے خاتمہ ہونے کے قریب قرار دیا۔ اور دجال کے پیدا ہونے اور حضرت مسیح کے آسمان پر سے اُترنے کے زمانہ سے مہدی موعود کے ہونے کا زمانہ ملا دیا۔ اور اِسی پر اب مسلمانوں کا اعتقاد ہے۔ (تہذیب الاخلاق جلد۱۔ صفحہ ۲۷۶)

متفرقات

(۳۷۰) میں اِن باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہو، مجھ کو گزند بھی

انسان کی ترقی کا حارج ہو جاتا ہے۔ جبکہ لغو اور مہمل رسومات ملکی اور قومی کا اُس میں خلط ہو جاتا ہے۔ تب وہ سم قاتل ہوتا ہے۔ (تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۱۴۷)

(۳۶۵) نجاتِ ابدی جو نتیجہ سچے مذہب یا سچے دین کا ہے۔ وہ دنیا کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے ایک شخص جس نے تمام عمر عسرت و تنگی میں بسر کی ہو۔ اور لباس برہنگی کے سوا اور کوئی لباس زیب تن نہ کیا ہو۔ اور بناس پتی کے سوا جَو کے بن چھنے آٹے کی روٹی بھی نہ نصیب نہ ہوئی ہو۔ وہ بھی سچے مذہب کی بدولت نجاتِ ابدی حاصل کر سکتا ہے۔ اور جس شخص نے لاکھوں کروڑوں روپیہ بطور جائز پیدا اور خرچ کئے ہوں۔ اور محمودی و تن زیب زیب تن کیا ہو اور محلوں میں سویا ہو اور باغوں کی ٹھنڈی ہوا میں پھرا ہو پری تمثال عربی گھوڑوں پر چڑھا ہو۔ وہ بھی سچے دین اور مذہب کی بدولت نجاتِ ابدی پا سکتا ہے۔ ہم دنیا میں بے انتہا مذاہب مختلفہ کے لوگ دیکھتے ہیں۔ جن میں بلا شبہ کوئی سچے اصول پر اور کوئی غلط بنیاد اور جھوٹے اصول پر مبنی ہو گا۔ اور ہر مذہب کے لوگوں میں تنگی و فراخی۔ دولت و مفلسی کو پاتے ہیں۔ اِسلئے یقین کرتے ہیں۔ کہ دنیا کسی کیساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۱)

(۳۶۶) ایک اور جھوٹا اور غلط خیال یہ ہے۔ کہ ترکِ دنیا عبادت ہے۔ یہ ایک ایسا غلط اور جھوٹا قول ہے۔ کہ اِس سے زیادہ دوسرا نہیں ہو سکتا دنیا کا ترک کرنا جس طرح کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ غیر ممکن ہے۔ دنیا ہمارے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور ہم دنیا کے لئے۔ پھر ہم اُس کو اُس طرح پر جس طرح کہ جھوٹے دنیا ترک کرنے والے ترک کرنے کو کہتے ہیں کیونکر ترک کر سکتے ہیں۔ ہاں جس طرح کہ شارع نے دنیا کا ترک کرنا بتایا ہے۔ اُس طرح پر ترک کرنا سچا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ہم دنیا کو اِس طرح پر پکڑیں کہ جس طرح شارع نے بتایا ہے۔ نہ اپنے جذباتِ نفسانی کی مرضی پر۔ اور اُس کو اِس طرح پر کام میں لاویں۔ جس طرح قانون قدرت نے ہم کو سکھایا ہے۔ نہ اپنی ہوائے نفسانی کے مطابق۔

(۳۶۷) انسان کی روحانی ترقی اور دنیاوی بہبودی اور حسن معاشرت اور علم و تجربہ کا کمال بہت کچھ اُس کے مسائل مذہبی کی تنقیح پر موقوف ہے۔ اوہام مذہبی کی تاریکی انسان

جن کے سبب سے دل کے لئے کاموں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ اور ہمیشہ اور ہر وقت دل کے مشغول رہنے کا سامان مہیا اور موجود رہتا ہے۔ انہیں قوتوں کے ذریعہ سے گذری ہوئی باتیں پھر دل میں آتی اور آئندہ کی باتوں کا ان کے ہونے سے پیشتر خیال ہوتا ہے۔

وہ عجیب قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں۔ ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے۔ جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لئے نہیں ملتی۔ تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بلا لاتی ہے۔ اور اسی کے ذکر یا خیال سے ہمارے دل کو بھلائے رکھتی ہے۔ اس کی مثال جگالی کرنے والے جانوروں کی ہے۔ کہ وہ پہلے تو گھانس دانہ سب کھا لیتے ہیں۔ اور جب ہو چکتا ہے۔ تو ایک کونے میں بیٹھ کر پھر اسی کو پیٹ میں نکال چبائے جاتے ہیں۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۱ صفحہ ۸۷)

(۳۶۳) لوگ کہتے ہیں۔ کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں۔ کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے۔ کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے۔ اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلف آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بُردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔ ؎

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مُردن (ایضاً جلد ۱ صفحہ ۱۱۱)

(۳۶۴) انسان کے خیالات جو آئندہ زندگی کی نسبت ہیں۔ جس کو معاد یا آخرت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جو مذہبی یقین سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کی ترقی کے اکثر مارج ہیں۔ بلاشبہ سچا مذہب جو درحقیقت خدا کی طرف سے دیا گیا ہو۔ وہ انسان کی کسی قسم کی ترقی کا مانع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان کا تنزل لوازم انسانیت سے خدا کا مقصد نہیں ہے۔ ورنہ انسان کو انسان بنانے کی کیا ضرورت ہوتی۔ مگر جب اس سچے مذہب میں بھی لغو خیالات اور بد تعصبات مل جاتے ہیں۔ تو وہ ویسا ہی

وہ عقلِ انسانی کے مافوق ہے۔ تو انسان اُس کا مکلّف نہیں ہوسکتا۔ (تحریر فی اصول التفسیر صفحہ ۱۱)

(۳۵۹) ہر شخص یہاں تک کہ شہد کی مکھی بھی الہام کا دعوے کرسکتی ہے۔ مگر اُس کا نتیجہ کیا اور کسی کو کسی کے الہام سے کیا فائدہ اور نقصان پہنچ سکتا ہے؟ نادان ہیں۔ وہ جو اُن سے جھگڑا کرتے ہیں۔ (حیات جاوید حصہ ۲ صفحہ ۵۳۶)

(۳۶۰) سب سے بڑا کام انسان کے لئے دنیا میں یہ ہے۔ کہ دنیا کو برتتے اور دل کو اُس سے تعلق نہ ہو۔ مولانا روم فرماتے ہیں "چیست دنیا از خدا غافل بودن" مگر میرے نزدیک اِس میں کسی قدر غلطی ہے۔ خدا سے غافل ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے خود خدا ایسا ہمارے پیچھے پڑا ہے۔ اگر ہم چھوڑنا بھی چاہیں۔ تو نہیں چھوٹتا اِسی طرح ہم بھی خدا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں۔ کہ اگر خدا خود چاہے۔ تو ہم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بھلا دیکھیں تو خدا ہم کو اپنے بندے اور اپنی مخلوق ہونے سے خارج تو کردے۔ خدا کی قدرت سے خارج ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۴۷)

(۳۶۱) کسی مسلمان نے آجتک بائبلِ مقدس کی تفسیر نہیں لکھی۔ خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جنکی وجہ سے ہمارے آباؤ اجداد نے اِس کام کو نہیں اُٹھایا۔ مگر جو امر کہ موجودہ زمانہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو اِس کام سے مانع رہا ہے۔ اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور لغو اور جھوٹے قصّوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں۔ اور اُن کے اِس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے۔ اِن دلائل سے بجز اِس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو۔ اور دونوں کے دل بُرے ہوں۔ اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ (حیات جاوید حصہ ۱۔ صفحہ ۱۲۰)

(۳۶۲) موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بُری ہو۔ انسان کے دل کے مشغلہ کو کافی نہیں ہوتی۔ موجودہ رنج و خوشی۔ محبت و دوستی کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں۔ کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں۔ اِسلئے اُس بڑے کاریگر نے جس نے انسان کے پتلے کو اپنے ہاتھ سے اور اپنی ہی مانند بنایا۔ اُس میں چند اور قوتیں دی ہیں۔

ہم اِس بات سے انکار نہیں کرتے۔ کہ انبیاء اور اولیاء کوئی غیبی آواز نہیں سنتے۔ سنتے ہوں گے۔ مگر وہ خدا کی آواز نہیں ہے بلکہ وہ اُس القا کا اثر ہے۔ جو اُن پر ہوا ہے۔ اور وہ اُن ہی کے نفس کی آواز ہے۔ جو اُن کے کان میں آئی ہے وہ بیداری میں اُس طرح آواز کو سنتے ہیں۔ جیسے کہ سوتے میں خواب دیکھنے والا سنتا ہے۔ یا جیسے کہ بعض دفعہ لوگوں کو جو کسی خیال میں مستغرق ہیں۔ بغیر کسی بولنے والے کے کان میں آواز آتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۴-۲۴۳، ۲۴۵-۲۴۶)

(۳۵۶) خدا کا دیکھنا دنیا میں نہ اِن آنکھوں سے ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُن آنکھوں سے جو دِل کی آنکھیں کہلاتی ہیں۔ اور نہ قیامت میں کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ بیچون وبیچگوں ہے۔ کسی جز وصورت میں آنے کی قابل نہیں ہے۔ پھر وہ کیونکر دنیا میں یا عقبیٰ میں دکھائی دے سکتا ہے۔ بہت سے عابد وزاہد دعوے کرتے ہیں۔ کہ ہم نے اِن آنکھوں سے دنیا ہی میں خدا کو دیکھا ہے۔ بہت سے کہتے ہیں۔ اِن آنکھوں سے نہیں۔ بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اُنہوں نے دیکھا دکھایا کچھ نہیں۔ بلکہ خود اُن ہی کا خیال یا ایقان ہے جو اُنہوں نے دیکھا ہوگا۔ عقبیٰ میں بھی اگر خدا کا دیکھنا تسلیم کیا جاوے۔ تو وہ بھی خدا کا دیکھنا نہ ہوگا بلکہ خود اُن ہی کا ایقان اُن کو دکھائی دے گا۔ نہ خدائے بیچون وبیچگوں وبے مثل وبے نموں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۵۳)

(۳۵۷) انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے۔ کہ جب اُس پر کوئی مصیبت آتی ہے اور اُس کے دل کو اضطرار ہوتا ہے۔ تو وہ کسی کی طرف استمداد اور استعانت کیلئے رجوع کرتا ہے۔ اگر وہ امر ایسا ہو۔ کہ کوئی انسان اُس کی مدد کر سکتا ہے۔ تو وہ انسان کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اگر وہ امر کسی انسان کی مدد سے بالاتر ہے۔ تو کسی ایسی ہستی سے امداد چاہتا ہے۔ جو اُس کے نزدیک اُس امر میں مدد کر سکتی ہے۔ (الدعاء والاستجابۃ صفحہ ۱)

(۳۵۸) خواہ یہ تسلیم کرو۔ کہ انسان مذہب یعنی خدا کی عبادت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ خواہ یہ کہو۔ کہ مذہب انسان کے لئے بنایا گیا ہے۔ دونوں حالتوں میں ضرور ہے۔ کہ انسان میں بہ نسبت دیگر حیوانات کے کوئی ایسی چیز ہو کہ وہ اُس بار کے اُٹھانیکا مکلف ہو۔ اور انسان میں وہ شئے گیا ہے؟ عقل ہے اِسلئے ضرور ہے۔ کہ جو مذہب اُسکو دیا جاوے۔ وہ عقل انسانی کا مافوق نہو۔ اگر

انسان کی روح اور جنس سے اور حیوانات کی روح کو اور جنس سے قرار دے سکیں اور اسلئے ہم انسان میں اور حیوانات میں ایک ہی جنس کی روح کے ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۷)

(۳۵۲) ہر انسان کی اصلی قیامت اُس کا مرنا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۴۱)

(۳۵۳) حوادث ارضی و سماوی حسب قوانین قدرت واقع ہوتے ہیں۔ اُن کو انسانوں کے گناہوں سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور نہ انسانوں کے گناہ اُن حوادث کے وقوع کا باعث ہوتے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۹۰)

(۳۵۴) سحر جس طرح کہ لوگ اُس پر یقین کرتے ہیں۔ اور عرفِ عام میں جس طرح پر وہ سمجھا جاتا ہے۔ اسکی کچھ اصلیت نہیں ہے۔ نہ قرآن مجید سے اُس کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ ہاں تمام انسانوں میں خواہ وہ انبیاء ہوں یا اولیاء یا عوام الناس اور کسی مذہب کے ہوں حتیٰ کہ حیوانوں میں بھی ایک قسم کی قوت مقناطیسی موجود ہے۔ جو خود اُس پر اور نیز دوسروں پر ایک قسم کا اثر پیدا کرتی ہے۔ یہ قوت بمقتضائے خلقت بعض میں ضعیف اور بعض میں قوی اور بعض میں اقویٰ ہوتی ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۱۳)

(۳۵۵) کلام خدا کا جب تک نہ سُنیں۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکتا۔ کہ کیسا ہوتا ہے۔ مگر انسانوں کا کلام جو سُننے میں آتا ہے۔ وہ تو یہ ہے۔ کہ زبان اور ہونٹ ہلتے ہیں۔ اُس سے بذریعہ ہوائے محیط کے ایک آواز کان تک پہنچتی ہے۔ ہر ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ بلکہ ہر لفظ کے پہلے حرف کے بعد دوسرا حرف نکلتا ہے۔ اور حرفوں سے مل کر لفظ اور لفظوں سے مل کر جملہ ہو جاتا ہے۔

میں خدا کے کلام کو اُس کی صفت سمجھتا ہوں۔ اور تمام صفاتِ خدا کو قدیم مانتا ہوں اور اسلئے خدا کے کلام کو بھی قدیم یقین کرتا ہوں۔ مگر دوسروں سے اِس بات میں مختلف ہوں کہ خدا کے کلام میں آواز ہے۔

آواز کی کوئی دوسری حقیقت بجز اِس کے کہ ہوا کی مدد اور زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نہیں جانتے۔ پس اُس کو بجنسہ خدا کی صفت قرار دینا۔ اور یہ خیال کرنا۔ کہ خدا کے منہ سے بھی مثل ہمارے منہ کے ایک حرف دوسرا حرف کے بعد نکلتا ہے۔ بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ پہلے ایک غلط امر کو تسلیم کیا ہے۔ پھر اُس کی بنا پر دوسری غلطی قائم کی ہے

سمجھنا انسان کی فطرت سے خارج ہے۔ اور یہی علوم علم اُن کی معرفت کیلئے کمال معرفت ہے (ایضاً)

(۲۴۹) جبکہ ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ بہت سے افعال حیوانات کے ایسے ہیں۔ جو صرف عناصر معلومہ کی ترکیب کا نتیجہ نہیں ہیں۔ تو ہم کو ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ حیوان میں کوئی اور ایسی شے ہے۔ جو تعقل کا باعث ہے۔ اور اِس نتیجہ پر ہم لازمی طور پر پہنچتے ہیں۔ اور اِسلئے حیوانات میں اُس شئے کے ہونیکا لازمی طور پر یقین کرتے ہیں۔ اور اُسی شئے کو جو وہ ہو ہم روح کہتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۴)

(۲۵۰) اب یہ سوال ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے۔ مگر اِس سوال کا جواب انسان کی فطرت سے باہر ہے انسان کی فطرت صرف اِس قدر ہے۔ کہ وہ اشیاء کے وجود کو ثابت کر سکتا ہے خواہ وہ اشیاء محسوس ہوں یا غیر محسوس۔ مگر اُن کی حقیقت کا جاننا اُس کی فطرت سے خارج ہے۔ کسی شئے کی بھی حقیقت انسان نہیں جانتا۔ اُن اشیاء کی بھی حقیقت نہیں جانتا۔ جو ہر دم اُس کے سامنے یا اُس کے استعمال میں ہیں۔ مثلاً پانی انسان یہ ثابت کر سکتا ہے۔ کہ پانی موجود ہے۔ مگر اُس کی حقیقت نہیں بتا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے۔ کہ اُس کے اجزاء کی۔ اگر اُس میں ہوں تشریح کر سکتا ہے۔ اور پھر اُن اجزاء کی حقیقت نہیں بیان کر سکتا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ پانی میں اکسیجن اور ہیڈروجن ہے۔ جب پوچھو۔ کہ اکسیجن اور ہیڈروجن کیا چیز ہے۔ تو اُس کی حقیقت نہیں بتا سکتا۔ پس جبکہ انسان اُن چیزوں کی حقیقت نہیں جان سکتا۔ جو اِسقدر عام ہیں۔ اگر وہ روح کی ماہیت بھی بعد اِس کے کہ اُس کے وجود کو ثابت کر چکا ہے۔ نہیں بیان کر سکتا۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

غرضیکہ جس قدر غور کی جاوے۔ حیوان میں علاوہ عناصر مرکبہ کے اور جو نتیجہ اِس ترکیب سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک اور شئے بھی پائی جاتی ہے۔ جس سے ارادہ۔ اور تعقل اور ایجاد اور ترقی مراتب تعقل میں صادر ہوتی ہے۔ اور اُسی شئے کو ہم روح کہتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۴-۱۲۵)

(۲۵۱) بیشک میں اِس بات کا قائل ہوں۔ کہ انسان میں اور تمام حیوانات میں ایک ہی سی روح ہے۔ ہم حیوانات میں بھی تعقل اور ارادہ پاتے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ ہم اُن میں بھی روح کا ہونا تسلیم نہ کریں۔ اور کوئی دلیل ہمارے پاس ایسی نہیں ہے جس سے ہم

خلافِ فطرت یا خلافِ جبلت یا خلافِ خلقت یا خلافِ قدر التی قدرہا اللہ کے امتناع پایا جاتا ہے جس کو ہم مختصر لفظوں میں یوں تعبیر کرتے ہیں۔ کہ کوئی امر خلاف قانون قدرت واقع نہیں ہوتا اور۔ اِسلئے معجزات و کرامات سے جبکہ اُن کے معنوں میں غیر مقید ہونا قانون قدرت کا مراد لیا جاوے۔ تو انکار کرتے ہیں۔ اور اگر اُن کے مفہوم میں یہ بھی داخل کیا جاوے۔ کہ وہ مطابقِ قانون قدرت کے واقع ہوئے ہیں۔ تو صرف نزاع لفظی باقی رہجاتی ہے۔ کیونکہ جو امر کہ واقع ہوا۔ اور جس شخص کے ہاتھ سے واقع ہوا۔ اُس کو ہم دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ مگر وہ اُس کا معجزہ یا کرامت نام رکھتے ہیں۔ ہم اُس کا یہ نام نہیں رکھتے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۷)

(۳۴۵) ہماری سمجھ میں کسی شخص میں معجزے یا کرامت کے ہونیکا یقین کرنا ذاتِ باری کی توحید فی الصفات پر ایمان کو ناقص اور ناکامل کردیتا ہے۔ اور اُس کا ثبوت پیر پرست و گور پرست لوگوں کے حالات سے جو اِس وقت بھی موجود ہیں۔ اور صرف معجزہ و کرامت کے خیال نے اُن کو پیر پرستی و گور پرستی کی رغبت دلائی ہے۔ اور خدائے قادرِ مطلق کے سوا دوسرے کی طرف اُن کو رجوع کیا ہے اور منتیں ماننا اور نذر و نیاز چڑھانا اور اُن کے نام کے نشانات بنانا اور جانوروں کی بھینٹ دینا سکھایا ہے۔ بخوبی حاصل ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۸)

(۳۴۶) ہمارا یہ یقین و تجربہ ہے۔ کہ انسان کو جس قدر علم فطرت۔ قوانین قدرت۔ علم السماء والافلاک بڑھتا جاتا ہے۔ اور نیچرل سائنس علوم طبعیات حقہ میں جس قدر اُس کی واقفیت اور مہارت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اُسی قدر اُس کو خدا کے وجود کا یقین اور اُس کی قدرت و عظمت اور شان الوہیت اور استحقاقِ معبودیت کا دل میں زیادہ نقش ہوتا جاتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۶۰)

(۳۴۷) تاویلات فاسدہ بھی اگر ہوں۔ تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں اسلئے کہ جو چیز غلط ہے اُسکی غلطی بہت دیر پا نہیں ہوسکتی۔ دوسروں کو اُسکی غلطی بیان کرنے کا اور غلط کو صحیح کرنے کا موقع ملتا ہے اور اگر وہ بیان نہ کی جاویں۔ تو سچ بات کے ظاہر ہونیکا موقع ہی نہیں ہوتا۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۶)

(۳۴۸) یہ بات سچ ہے۔ کہ بہت سے حقائق ایسے ہیں۔ جن پر انسان کو یقین کرنے کے لئے دلیل ہے۔ مگر اُن کی حقیقت جاننا انسان کی فطرت سے خارج ہے۔ مگر اِس قسم کے حقائق ہمارے استدلال میں کچھ نقص ڈالنے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ دلیل سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُن کا جاننا یا

گو طریقہ عمل میں کچھ کچھ اختلاف ہو مثلاً معبود کا یقین۔ اُسکی پرستش کا خیال۔ موت کے بعد اعمال کی جزا و سزا۔ دوسرے جہاں کا وجود کسی ہادی یا رہنمائے روحانی کا ہونا۔ دنیاوی معاملات میں۔ تزوج۔ سر گروہ کا مقرر کرنا اور اُس کے تابع رہنا۔ افعال میں۔ رحم دلی ہمدردی سچائی کا اچھا سمجھنا۔ زنا۔ چوری قتل جھوٹ کو بُرا جاننا۔ یہ اور اُس کے مثل اور بہت سے امور ہیں جن میں تمام دنیا کے انسانوں کو متفق پاتے ہیں۔ چند کا اِن اتفاقوں میں سے مستثنےٰ ہونا جن کے اسباب بھی جدا ہیں۔ اِس کلیہ کے متناقض نہیں ہے۔

یہ خیال کرنا کہ اِن سب نے ایک ایسے زمانہ میں جبکہ سب یکجا ہوں گے اِن باتوں کو سیکھا ہوگا۔ اور متفرق ہو جانے کے بعد بھی۔ وہ اُن سب باتوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک ایسا خیال ہے جس کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئیے۔ کہ ناممکن ہے۔ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں۔ کہ وہ سب کسی زمانہ میں یکجا تھے۔ تو بھی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے افتراق نے اُن کی حالت کو (جو ضرور ہے کہ بے انتہا زمانہ کی مفارقت کا باعث ہوئی ہوگی) ایسا تبدیل کر دیا ہے۔ کہ صورت میں۔ رنگت میں طبیعت میں۔ اعضا کی ساخت میں۔ اُن کے جوڑ بند میں۔ اُن کی زبان میں ایک تبدیلی عظیم واقع ہوگئی ہے تو یہ کیونکر تسلیم ہو سکتا ہے۔ کہ وہ خود تو بدل گئے۔ مگر جو سبق اُنھوں نے سیکھا تھا۔ وہ نسل در نسل نہ بھولے۔ بلکہ برخلاف اِس کے وہ اِس بات کی دلیل ہو سکتی ہے۔ اُسی وحی یا فطرت کا باعث ہے۔ جو خدا نے انسان کو ودیعت کی ہے۔

مگر خدا نے اِس فطرت کو جسکو ہم نے عقل انسانی یا عقل کلی سے تعبیر کیا ہے ایسا نہیں بنایا کہ سب میں برابر ہو۔ یا سب میں ایک سا اُس کا ظہور ہو بلکہ انسان کے پتلے میں اُس کے اعضاء کی بناوٹ اس طور پر بنائی ہے کہ اِس فطرت کا ظہور بہ تفاوت اور بانواع مختلف ہوتا ہے پس اِس فطرت سے جس شخص کو اعلیٰ درجہ کا حصہ اور جس نوع کا دیا جاتا ہے وہ اوروں کیلئے اُس نوع کا ہادی یا پیشوا ہو جاتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۸)

(۴۳) حکما و فلاسفہ نے معجزات یا کرامات کا انکار کسی وجہ سے کیا ہو مگر ہمارا انکار صرف اِس بنا پر نہیں ہے۔ کہ وہ مخالف عقل کے ہیں اور اِسلئے اُن سے انکار کرنا ضرور ہے۔ بلکہ ہمارا انکار اِس بناء پر ہے کہ قرآن مجید سے معجزات و کرامات یعنی ظہور امور کا بطور خرق عادت یعنی

(۳۴۱) خدا نے انسان میں ایک ایسی قوت رکھی ہے۔ جو دوسرے انسان میں اور دوسرے انسان کے خیال میں اثر کرتی ہے۔ اور اُس سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں۔ جو نہایت عجیب معلوم ہوتے ہیں اور جن میں سے بعض کی علت ہم جانتے ہیں۔ اور بہت سوں کی علت نہیں جانتے۔ بلکہ اُسکے عامل بھی اُس کی علت نہیں جانتے۔ اُسی قوت پر اِس زمانہ میں اُن علوم کی بنیاد قائم ہوئی ہے جو مسمریزم اور اسپرچولزم کے نام سے مشہور ہیں۔ اور سابقین بھی اُس کے عامل تھے۔ مگر اُس علم سے ناواقف تھے۔ یا اسکو مخفی رکھتے تھے۔ مگر جبکہ وہ ایک قوت ہے۔ قواء انسانی میں سے اور ہر ایک انسان میں بالقوے موجود ہے جیسی قوتِ کتابت۔ تو اُس کا کسی انسان سے ظاہر ہونا معجزہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو فطرت انسانی میں سے انسان کی ایک فطرت ہے۔ (تفسیر القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۲۶)

(۳۴۲) انسان میں ایک اَور ودیعت الٰہی جس کو عقلِ انسانی یا عقلِ کُلی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ہوتی ہے۔ یہ وہی ودیعت ہے جس سے انسان چند واقعاتِ وقوعی یا مقدمات ذہنی سے ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اور جزئیات کے تتبع سے کلیہ قاعدہ بناتا ہے۔ یا قاعدۂ کلیہ سے جزئیات کو حاصل کرتا ہے۔ ابتدا سے یعنی جب سے کہ انسان نے انسانی جامہ پہنا ہے۔ وہ اِس ودیعت کو کام میں لاتا رہا ہے۔ اور جب تک کہ وہ ہے۔ کام میں لاتا رہے گا۔

یہی ودیعت ہے جس نے انسان کو نئی نئی ایجادوں اور حقائق اشیاء کی حقیقتوں اور علم و فنون کے مباحثوں پر قادر کیا ہے۔ یہی ودیعت ہے جس سے انسان انبساط کی طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ غور کرتا ہے۔ کہ کن محسوسی اور ذہنی چیزوں سے وہ خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ پھر وہ اُن کے جمع کرنے اور ترتیب دینے یا ایجاد کرنے میں کوشش کرتا ہے۔ یہی ودیعت ہے جس سے انسان کا دل ہر ایک واقعہ کی نسبت اِس طرف مائل ہوتا ہے۔ کہ یہ کیوں ہوا؟ اور پھر اِس سے کیا ہوگا؟ یہی ودیعت ہے جس کے سبب سے انسان کے دل میں خالق کا سزا و جزا کا۔ معاد کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ (تفسیر القرآن۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۷)

(۳۴۳) یہ حقیقت زیادہ تر وضاحت اور تعجب انگیز طریقہ سے منکشف ہوتی ہے۔ جبکہ تمام دنیا کے انسانوں کو جہاں تک کہ ہم کو اُن سے واقفیت ہے۔ باوجود اُن کی زبان۔ اُن کی قوم۔ اُنکے ملک۔ اُن کی صورت۔ اُن کی رنگت کے اختلاف کے بہت سی باتوں میں متفق پاتے ہیں۔

بمقابلہ منکران نبوت صادر ہوتا ہے قبل ولادت حضرت مسیح بلکہ قبل ادعائے نبوت یا الوہیت کوئی شخص منکر نہیں ہو سکتا تھا پھر معجزہ کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ مہذا اگر وہ معجزہ ہوتا۔ تو حضرت مریم کا معجزہ ہوتا۔ نہ حضرت مسیح کا۔ علاوہ اِس کے جبکہ اُن کی ولادت ٹھیک اُسی طرح پر واقع ہوئی تھی جس طرح کہ عموماً بچوں کی ہوتی ہے۔ کہ نو مہینہ تک حمل میں رہے۔ اور بوقت ولادت حضرت مریم پر وہ تمام حالات طاری ہوئے۔ جو عموماً عورتوں پر بچہ ہونے میں طاری ہوتے ہیں تو کسی طرح اعجازاً اُن کے پیدا ہونے کا کسی کو احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ (ایضاً صفحہ ۲۴)

(۲۴۰) تمام اہل مذاہب خواہ صحیح مذہب رکھتے ہوں یا غلط۔ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ جُہلا اور علماء جہلا کا یقین مذہبی باتوں پر نہایت پختہ اور مستحکم ہوتا ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے سمجھا ہے۔ یا سیکھا ہے۔ اُس کے سواء وہ اور کچھ نہیں جانتے۔ اور کوئی شبہ اُن کے دل میں نہیں ہوتا۔ اُنکی مثال اندھے آدمی کی سی ہے۔ کہ وہ اُس رستہ پر جو اُس کو کسی نے بتلا دیا ہے۔ چلا جاتا ہے اور اُس کے ٹھیک ہونے پر یقین رکھتا ہے۔ اور خود نہیں جانتا کہ درحقیقت یہ رستہ اُسی جگہ جاتا ہے جہاں اُس کو جانا ہے یا نہیں پھر اگر کسی نے کہدیا۔ کہ میاں اندھے آگے گڑھا ہے یا دیوار ہے تو وہ بغیر کسی شک کے اُس پر یقین کر لیتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔ پھر جس نے جو راہ بتائی۔ اُس طرف ہو لیا۔ یہی جُہلائے اہل مذہب کا حال ہے جس مذہب میں وہ ہیں۔ اُن کو اُس پر ذرا بھی شبہ نہیں۔

علماء کا حال اِس کے برخلاف ہوتا ہے۔ گو وہ بھی مذہب کی پیروی کرتے ہیں اور جس مذہب میں وہ ہیں۔ اُس کو سچ کہتے ہیں۔ اور دل میں بھی اُس پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر اُن کا دل شبہ سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ مذہب کے ہزاروں مسئلوں کو سچ کہتے ہیں۔ مگر اُن کی عقل اُن کو قبول نہیں کرتی اُن کا علم اُن کے ویسے ہی ہونے پر اُن کی تصدیق نہیں کرتا۔ اور جب وہ اُس پر سچا یقین نہیں کر سکتے تو اپنے دل کو سمجھاتے ہیں کہ گو یہ بات عقل سے اور سمجھ سے دور ہو۔ مگر مذہب کے زور سے ہم کو یوں ہی ماننا اور اُس پر یقین کرنا ضرور ہے پس درحقیقت اُن پر اُن کو سچا یقین نہیں ہوتا دل میں ایک کانٹا کھٹکتا رہتا ہے۔ اور جس پر اُن کو حقیقی یقین نہیں ہوتا اُس پر یقین جتلانا چاہتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۳)

(۳۳۷) حی لایموت کے الفاظ سے ہم کو اُسی زندگی اور موت کا خیال آتا ہے۔ جو ہم انسانوں اور حیوانوں میں دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ذاتِ باری اُس حیات و ممات سے جس کو ہم جانتے ہیں بری ہے۔ سمیع و بصیر و علیم ہونے کی صفات کو بجز اُس قوت اور حس کے جو ہم کو بذریعہ کانوں اور آنکھوں اور بعد وجود معلومات کے اُن کے ادراک سے حاصل ہوتی ہے۔ اور کچھ نہیں جانتے۔ حالانکہ ذات باری اِس قسم کی صفات سے بری ہے۔ رحم و غضب و قہر سے ہم اُن ہی صفات کو سمجھتے ہیں۔ جو ہمارے دل کو کسی کی حالت زار دیکھ کر لاحق ہوتی ہیں۔ اور ہمارا دل اُس سے متاثر ہو کر مضطر و رقیق ہو جاتا ہے۔ یا کسی مخالف کی مخالفت یا خلاف طبع امر سرزد ہونے کے سبب ہمارے دل میں ایک جوش انتقام لینے کا اور ایسے فعل کے کرنے کا جس سے ہمارے جوشِ غضب کو تسکین ہو۔ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر ذاتِ باری اِس قسم کی صفت رحم و قہر سے پاک و منزا ہے۔ (تفسیر القرآن۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴)

(۳۳۸) عیسائی اور مسلمان دونوں خیال کرتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ صرف خدا کے حکم سے عام انسانی پیدائش کے برخلاف بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اگر ایسا ہی ہونا فرض کیا جاوے تو اول اِس بات پر غور کرنی ہوگی۔ کہ بغیر باپ کے پیدا کرنے میں حکمتِ الٰہی کیا ہو سکتی ہے۔ ایسے واقعات جو خلافِ عادت یا مافوق الفطرت تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اُن سے یا تو قدرتِ کاملۂ پروردگار کا اظہار مقصود ہونا چاہئے۔ یا اُن کا وقوع بطور معجزہ مانا جاوے جبکہ خدا تعالےٰ اقسام حیوانات کو بغیر توالد و تناسل کے عادتاً پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور خود انسان کو بھی بلکہ تمام حیوانات کو ابتداءً اُس نے اِسی طرح پیدا کیا ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ حضرتِ آدم کو بے ماں و بے باپ کے پیدا کیا تھا۔ تو حضرت عیسےٰ کے صرف بے باپ کے پیدا کرنے میں اُس سے زیادہ قدرتِ کاملہ کا اظہار نہ تھا۔ اگر یہ خیال کیا جاوے۔ کہ صرف ماں سے پیدا کرنا دوسری طرح پر اظہار قدرتِ کاملہ تھا۔ تو یہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ اظہار قدرت کاملہ کیلئے ایک امر بیّن اور ایسا ظاہر ہونا چاہئے۔ کہ جس میں کسی کو شبہ نہ رہے بن باپ کے مولود کا ہونا ایک ایسا امر مخفی ہے جسکی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اظہارِ قدرتِ کاملہ کے لئے کیا گیا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۲)

(۳۳۹) حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے پر معجزہ کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا معجزہ

کہ جب سب کے سب ایسے ہی ہو جاویں۔ تو دنیا سے شر اُٹھ جاوے۔ مگر پوچھا جاتا ہے۔ کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ایسا ہوگا؟ یہ سب ناشدنی باتیں ہیں۔ جو خیال میں شدنی قرار دے کر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے۔

انجیل میں لکھا ہے۔ کہ تو اپنے کل کے کھانے کی فکر مت کر۔ خدا کل کی روزی پہنچانے کی فکر کرنے والا ہے۔" دل کو یہ مقولہ نہایت ہی پیارا اور اُس پیارے خدا پر اعتماد دلانیوالا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کبھی کسی نے اِس پر عمل کیا ہے؟ آئندہ کبھی اِس پر عمل ہوگا؟ اگر ہم اِس ناشدنی امر کو ایک لحمہ کے لئے شدنی تصور کرکے تمام دنیا کے لوگوں کو اِسی مقولہ پر عمل کرتا ہوا سمجھ لیں تو دنیا کا کیا حال ہوگا؟ پس اِس قسم کی تمام باتیں انسان کو دھوکہ دینے والی ہیں۔ اور قانون قدرت کے برخلاف ہونے کا خود اپنی سچائی کو مشتبہ کرتی ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۵۰)

(۲۳۵) عیسائی مذہب جس کی جڑھ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی۔ وہ پھولا اور پھلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اِس کو چھوڑ دو۔ کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سرسبز ہوا مگر دیکھو۔ کہ اُس نے کیا پھل پیدا کیا۔ ایک بھی نصیحت اُس کی کام نہ آئی۔ اور خود مذہب نے جو خونریزی اور بیرحمی اور ناانصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھلائی وہ شائد دنیا میں بمشکل ہوگی۔ اور جس نیکی میں اُس کی جڑھ لگائی گئی تھی۔ اُس نے کچھ پھل نہیں دیا کیونکہ قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں۔ کیا یہ پھل اُسی درخت کا ہے۔ جس کی جڑھ ایسی نیکی میں لگائی گئی تھی۔ جو خلاف قانون قدرت تھی؟ حاشا و کلاّ۔ بلکہ یہ اُسکا پھل ہے۔ کہ اُس درخت کو وہاں سے اُکھاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے۔ جو قانون قدرت کی زمین ہے۔ اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اُس کی جڑھ میں لگی ہوئی ہے۔ اُسی قدر اُس میں نقصان ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۵۱)

(۲۳۶) اَن سویلائیزڈ زندگی بھی ایک طرح پر نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ اور دل کی سادگی اور بے گناہ زندگی کے سبب تقدس کی طرف زیادہ میلان رکھتی ہے۔ اور خیالات کو بن سمجھے خدا کی طرف زیادہ رجوع کرتی ہے۔ بے سمجھا الیقین دل پر بہت بڑا اثر رکھتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۶۳)

نبی ہوتا ہے۔ جب پیدا ہوتا ہے۔ تو نبی ہی پیدا ہوتا ہے۔ جب مرتا ہے تو نبی ہی مرتا ہے۔

(۳۳۲) نبوت درحقیقت ایک فطری چیز ہے۔ جو انبیاء میں بمقتضائے اپنی فطرت کے مثل دیگر قواء انسانی کے ہوتی ہے۔ جس انسان میں وہ قوت ہوتی ہے۔ وہ نبی ہوتا ہے۔ اور جو نبی ہوتا ہے۔ اُس میں وہ قوت ہوتی ہے۔ جس طرح کہ تمام ملکات انسانی اُس کی ترکیب اعضاء دل و دماغ خلقت کی مناسبت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اُسی طرح ملکۂ نبوت بھی اُس سے علاقہ رکھتا ہے۔ یہ بات کچھ ملکۂ نبوت پر ہی موقوف نہیں ہے۔ ہزاروں قسم کے جو ملکات انسانی ہیں بعض دفعہ کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں از روئے خلقت و فطرت کے ایسا قوی ہوتا ہے۔ کہ وہ اُس کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہے۔ لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ ایک طبیب بھی فن طب کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے اور جس میں اخلاق انسان کی تعلیم و تربیت کا ملکہ بمقتضائے اُسکی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے۔ وہ پیغمبر کہلاتا ہے اور جس طرح کہ اور قواء انسانی بمناسبت اُس کے اعضا کے قوی ہوتے جاتے ہیں۔ اُسی طرح یہ ملکہ بھی قوی ہوتا جاتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۳۱)

(۳۳۳) خدا کی تجلی ہر چیز میں ہے جسکو اُس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے بنایا۔ اور پیدا کیا۔ مگر کسی مادی یا انسانی صورت میں نہ خدا آسکتا ہے نہ سما سکتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۱۳)

(۳۳۴) کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بُردبار اور تحمل کرنیوالی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھانے والی جس سے آنکھوں میں چکا چوند آجاوے۔ نہیں ہے گو اُس کے مقولے ایسے نہیں ہیں۔ کہ سب سے پہلے اُسی میں بیان کئے گئے ہوں۔ بلکہ بہت سے ایسے ہیں۔ جو اُس سے پہلے لوگوں نے بھی جن کے پیرو اب بُت پرست اور کافر گنے جاتے ہیں بیان کئے ہیں۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہئے اُن کا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا۔

انجیل میں لکھا ہے۔ کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے۔ تو دوسرا گال بھی اُس کے سامنے کر دے"۔ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اِس پر عمل کیا ہے؟ اگر دنیا اِس پر عمل کرے۔ تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اِسی طرح آباد رہے اور اِسی طرح لوگوں کی جان و مال امن میں رہیں۔ نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے

رُو سے کیسے متناقض کیوں نہ ہوں۔ اِس مسئلہ کا اُن کو ایسا دلی اعتقاد ہے۔ کہ جو کوشش اُن کے اِس اعتقاد کے سُست اور متزلزل کرنے میں کی جاوے۔ وہ یقیناً ناکام ہو گی۔ وہ ہر حجت اور دلیل کے سننے سے یا اُس پر ذرا سی بھی غور کرنے سے جو اُن کے دل نشین عقیدہ کے مخالف ہو۔ ضد سے انکار کئے جاویں گے۔ ایسے سادہ مزاج اور صاف باطن آدمیوں کو بہشتی آدمیوں کا لقب دیا گیا ہے۔ (خُطبات احمدیہ)

(۲۳۵) تمام بے اعتقاد مصنف جنہوں نے احکام الٰہی کا فلسفہ کے رُو سے امتحان کیا ہے دین عیسوی کو کُفر بتا کر مضرت پہنچانے میں اس قدر ساعی نہیں ہوئے ہیں۔ جس قدر کہ حضراتِ اہل سیر ہوئے ہیں۔ انہوں نے چشمۂ آب ہی کو زہریلا کر دیا ہے۔ اور اُن بے اعتقاد مصنفین نے اُس کا پانی پینے سے لوگوں کو باز رکھا ہے۔ اُن کی سریع الاعتقادی نے جو اِس وجہ سے عارض ہوئی تھی۔ کہ وہ طبائع و معاملاتِ انسانی سے محض ناتجربہ کاری اور علوم طبعی سے بالکل ناواقفیت رکھتے تھے۔ انجیل کی بے شرمانہ تحریفات و تصرفات کی استعانت سے کلیسائے روم میں عجیب و غریب بیہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر شائع کر دیا جنکو باوجود داد و فریادِ عقل کے خوش اعتقادی اب بھی ہضم کرتی جاتی ہے صرف اِسی قدر مضرت اُن سے نہیں پہنچی ہے۔ اُنہوں نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا۔ انہوں نے اِس مسئلہ کی (بقول مؤلّف) تلقین کی۔ کہ دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا۔ جبکہ اِن کے ذریعہ سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں۔ ثواب ہے۔ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ کہ اِس مطلق العنان اصول نے دروغ گوئیوں اور جعلسازیوں کے چشمہ کا دہانا کھول دیا۔ جس کا پانی ابتدائے دین عیسوی کی سرزمین پر مثل طوفان کے چھا گیا۔ اور اُن فریبوں۔ اور باطنی ذخیروں کو جو فی زماننا عیسائیان رومن کیتھلک کو انگشت نما اور بدنام کرتے ہیں۔ رواج دیا۔ اہل سیر میں اول سے لیکر آخر تک سب سے بڑا خاصہ یہ پایا جاتا ہے۔ کہ کفر آمیز سفلگی۔ سریع الاعتقادی تعصب اور فریب دہی کے حامی تھے باایں ہمہ ایسے لوگوں کو جانشینان پطرس حواری نے پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں لکھا ہے۔ (ایضاً)

(۲۳۶) میں نبوت کو ایک فطری چیز سمجھتا ہوں۔ نبی گو اپنی ماں کے پیٹ میں ہی کیوں نہو

اور جس کا نام امید وبیم یا خوف ورجا ہے۔ اِن ہی دونوں قسم کے خیالوں سے ہم آئندہ زمانہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور جو باتیں کہ دور زمانہ میں شاید ہونے والی ہیں۔ اور ظلمات کے پردوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ اور بڑے گہرے اندھیرے گڑھوں میں پڑی ہوئی ہیں۔ اُن کو ایسا سمجھتے ہیں۔ کہ ابھی ہو رہی ہیں۔ اُن کے ہونے سے پہلے اُن کی خوشی یا رنج اٹھانے لگتے ہیں یہاں تک کہ اُس زمانہ کا بھی جب نہ یہ زمین ہوگی نہ آسمان۔ اور ہر چہار طرف سے لمن الملک الیوم کی آواز آتی ہوگی۔ اب ہی خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف موجودہ وقت پر محدود ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۷۷)

(۳۲۷) بے علمی ایک عجیب صفت معصومیت کی ہے۔ دل کو راحت میں طبیعت کو طمانیت میں رکھنے والی جیسی بے علمی ہے۔ ایسی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ جو کچھ وہ جانتا ہے۔ اُسکو سچ سمجھتا ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے۔ اُسکو ٹھیک جانتا ہے۔ ایک جھیل ہے۔ جس میں کوئی لہر ہی نہیں۔ کناروں تک پانی بھرا ہوا ہے۔ مگر ہلتا تک نہیں۔ نہ اُس میں کوئی مچھلی ہے کہ تیرے نہ کوئی مینڈک ہے۔ کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر غوطہ لگائے۔ نہ دل میں کچھ ڈبکا ہے۔ نہ کسی بات کے سوچنے کی حاجت۔ جس نے جو کہا اُس کو سچ جانا۔ اور جو جس نے بتایا اُس کو مانا۔ ان ہی لوگوں کا مذہب صحیح ہو یا غلط نہایت پختہ اور مضبوط ہے۔ جس میں ذرا سی بھی کھسر اور کچھ بھی کسر نہیں ہے۔ اِن کی زندگی اچھی ہو یا بُری راہ پر ہو یا گمراہ حیوان مطلق بلکہ ایک جماد متحرک کیسی ہو۔ مگر وہ کیسی ہی ہو۔ بے تردد اور بے خدشہ اور عاری عنی الشبہات ہے۔ (ایضاً جلد ا سنہ ۱۳۱۱ھ صفحہ ۳۹)

(۳۲۸) ہم دنیا کو دیکھتے ہیں۔ اور قبول کرتے ہیں۔ کہ ایک ہی مادہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ علماء علوم جدیدہ کہتے ہیں لیکن اِس میں برابر تغیرات پاتے ہیں۔ اور یہی تغیرات ہر عالم وجاہل کو اِس بات کے یقین کرنے پر کہ وہ **حادث** ہے کافی ہیں۔ (ایضاً)

(۳۲۹) اکثر عالم ایسے گذرے ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ میں اپنی نیک دلی سے نہایت سچا اور مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ اِس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کو اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر ایک امر کرنے کا پورا اختیار رہے۔ گو وہ کام عقل اور قوانین فطرت کی

تک اُس کے تذکرے اور چرچے میں مشغول رہتے ہوں۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ تاریخانہ واقعات میں جو بادشاہوں اور سلطنتوں اور ملکوں کے حالات میں لکھے جاتے ہیں۔ ایسی زائد اور بے اصل باتوں کا میل کم تر ہوتا ہے۔ مگر واقعات مذہبی ایسے قسم کے ہوتے ہیں۔ جن کا چرچا اور تذکرہ زمانۂ دراز تک قائم رہتا ہے۔ بلکہ برابر چلا جاتا ہے۔ اِسلئے زائد اور بے اصل باتیں اُن واقعات میں شامل ہو جاتی ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۷)

(۳۲۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کسی عورت کو اپنی زوجیت میں نہ لانا اُن کے تقدس کو جو بسبب نبی اور صاحبِ کتاب ہونے کے تھا۔ کچھ زیادہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اُس کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کو تمام یہودی نعوذ باللہ اولاد جائز نہیں سمجھتے تھے۔ پس اُن کے ساتھ کسی یہودن کا عقد ہونا ممکن نہ تھا۔ اور یہودی دوسری قوم کی عورت سے عقد نہیں کرتے تھے۔ معہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی عمر کا زمانہ مہاجرت میں گذرا اور اخیر زمانہ کچھ بہت طویل نہ تھا۔ کیونکہ صرف تینتیس برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔ اور اُسوقت تک ستر آدمی آپ پر ایمان لائے تھے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۴۵)

(۳۲۳) پس تمام عبادت اور تمام شکر اور تمام انسانیت یہی ہے۔ کہ انسان اپنے تمام قوے کو جو خدا نے اُس کو دئیے ہیں۔ کام میں لاتا رہے۔ اور اُسی طرح پر کام میں لاوے جس طرح کہ اُن کا کام میں لانا اُن کے صانع کی مرضی ہو۔ (تہذیب الاخلاق جلد ۳۔ صفحہ ۸۷)

(۳۲۴) یہ تمام موجودات عام عقل انسانی کے لئے بخوبی اِس بات کی رہنما ہیں۔ کہ اُن کا کوئی خالق ہے۔ اور اِسلئے وجودِ خالق پر ایمان لانے کا ایسا مسئلہ ہے۔ کہ عام عقلِ انسانی اُسکو بخوبی سمجھ سکتی ہے۔ اور اِسی سبب سے انسان اُس پر ایمان لانے کو مکلّف ہوا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۰۵)

(۳۲۵) سمجھ صرف باتوں ہی میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی متعلق ہے اور گویا ہماری زندگی ہمارے تمام کاموں کی رہنما اور ہمارے لئے ہمارے قادرِ مطلق خدا کی نائب ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۶۰)

(۳۲۶) جس طرح کہ یادِ پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل کے مشغلہ کو بلا لاتی ہے اُسیطرح ایک اور قوت ہے۔ جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے۔

زُہرہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ہم چو بُرہانے کہ من دارم

(۳۱۷) یہ سوال عقلاً نہیں ہوسکتا۔ کہ "خدا نے یہ تمام کائنات کیوں اور کس مقصد سے پیدا کی ہے" چونکہ خدا کی اور اُس کی صنعت کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا جاننا فطرتِ انسانی سے خارج ہے۔ پس خدا کی اور خدا کے کاموں کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہیں ہے اور اِسی لئے یہ سوال خدا کی نسبت کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ غلط ہے۔ (سرسید کے آخری مضامین صفحہ ۲۷)

(۳۱۸) انسان کی یہ جبلت ہے۔ کہ جس چیز کو بزرگ سمجھتا ہے اور جن اشخاص کو مقدس جانتا ہے۔ اُن کی نسبت ایسے عجائبات منسوب کردیتا ہے۔ جو قابلِ یقین نہیں ہوتے۔ مگر وہ لوگ اُن کو خیال کرتے ہیں۔ پس رفتہ رفتہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جم گئی ہے کہ عجائبات کے بغیر نہ مذہب چلتا ہے۔ نہ لوگ ایسے مذہب کو جس میں کچھ عجائبات نہ ہوں قبول کرتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۳)

(۳۱۹) کوئی مذہب جو سچا ہے اور سچا ہونے کا دعوے کرتا ہے۔ اُس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے۔ جو فطرت کے خلاف ہوں عقل انسانی کے خلاف ہوں۔ اور کوئی سمجھ دار آدمی اُن کو تسلیم نہ کرے۔ بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔ گو کہ بعد کو اُس کے ماننے والوں نے عجائبات پرستی کی راہ سے اُس میں بہت سے عجائبات شامل کردیئے ہوں۔ (ایضاً)

(۳۲۰) دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں جن کو اکثر ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ مگر جو لوگ کہ اہل اللہ کہلاتے ہیں وہ اور اُن کے معتقدین اُس کو کرشمۂ ربانی سمجھتے ہیں۔ اور جو لوگ اہلِ دنیا کہلاتے ہیں۔ وہ اُن کو واقعاتِ اتفاقی سمجھ کر کچھ خیال نہیں کرتے۔ (ایضاً صفحہ ۹)

(۳۲۱) یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ کہ جو واقعہ کسی زمانہ میں گذرتا ہے۔ بشرطیکہ وہ واقع ایسا ہو۔ کہ آئندہ زمانہ کے لوگ اُس کے تذکرے میں مشغول رہتے ہوں۔ اور اُس کا چرچا قائم رکھتے ہوں۔ تو جس قدر زمانہ گذرتا جاتا ہے۔ اُسی قدر اِس میں زائد باتیں۔ جو اِس واقعہ میں درحقیقت نہیں ہوئیں۔ ملتی جاتی ہیں۔

دنیاوی واقعات میں ایسا کم ہوتا ہے۔ بلکہ نہیں ہوتا۔ کہ آئندہ زمانہ کے لوگ مدت دراز

ملکوں میں ترقی ہوتی ہے۔ آجکل وہی ملک دولتمند ہو رہا ہے جسکی چیزوں کی تجارت دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے۔ ہندوستان کی چیزیں اگرچہ دوسرے ملک میں جاتی ہیں۔ مگر محنت کی قیمت بڑھاکر پھر اسی ہندوستان میں آجاتی ہیں۔ ہمارے ملک کی چیزوں کی نسبت بھی ہم لوگوں کی تجارت ایک بندرگاہ سے دوسرے بندرگاہ تک یا ایک شہر سے دوسرے شہر تک محدود ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی گرہ کاٹتا ہے۔ ہم لوگ اپنی چیز دوسرے ملک میں نہیں لیجاتے۔ نہ دوسرے ملک کی چیز اپنے ملک میں لاتے ہیں۔ ہم دریا کے کنارہ پر بلکہ اس زمانہ میں اپنی دُکان سے چند قدم فاصلہ پر ریل کے اسٹیشن پر چار آنہ کی چیز سوا چار آنہ پر بیچ ڈالتے ہیں یا وہیں پر اِس طرح سے خرید کر اپنے ملک میں بیچتے ہیں۔ سمندر کے اندر ہمارا کچھ حصہ نہیں ہے۔ غیر ملکوں سے ہمارا کچھ رشتہ نہیں ہے۔ ہم کو چاہئیے کہ دوسرے ملک میں آڑہتھ اور کمپنیاں قائم کریں جس سے اعلیٰ درجہ کے تاجر ہوں ملک کی پیداوار۔ قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی پڑی ہیں۔ اُن سے فائدہ اُٹھاویں۔ اِس طریقہ سے کہ اپنے ملک میں اپنے ہی ایک بھائی کا روپیہ لیکر فائدہ اُٹھاویں۔ ملک میں ترقی نہیں ہو سکتی روپیہ کو کبھی اِس تھیلی میں اور کبھی اُس تھیلی میں ڈالنے سے روپیہ بڑھ نہیں جاتا جب تک کہ باہر سے لاکر اُس میں روپیہ ڈالا نہ جاوے۔ جب تم ایسا کرو گے اُس وقت بیشک جس طرح ہمارے ملک کا روپیہ دوسرے ملک میں جاتا ہے ہم بھی دوسرے ملک کا روپیہ اپنے ملک میں کھینچ لاوینگے۔

([illegible] صفحہ ۱۲۱)

مذہبی

(۳۱۶)

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک مے دارد بہ درمانے کہ من دارم

زکفرِ من چہ میخواہی ز ایمانم چہ مے پرسی
ہماں یک جلوۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم دلے بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمے خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلعِ خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاراں انجنیں دارد گریبانے کہ من دارم

گو کہ خدا ہی تعبیر کرنا چاہے محالات سے ہے۔ (ایضاً)

(۳۱۱) جبکہ انسان کو ایک بات کے کرنے اور ایک بات کے نہ کرنے کو کہا جاوے تو بالطبع انسان اُس کی منفعت اور مضرت کے جاننے کا خواہاں ہوتا ہے اور بغیر جانے اُس کے کرنے یا نہ کرنے پر راغب یا متنفر نہیں ہوتا۔ اِسواسطے ہر ایک پیغمبر کو بلکہ ہر ایک ریفارمر یعنی مصلح کو اُس منفعت و مضرت کا کسی تمثیل و تشبیہ سے بتانا پڑتا ہے۔ (ایضاً)

(۳۱۲) حکماء الٰہی اور انبیاء ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے۔ کہ حکماء صرف اُن چند لوگوں کو تربیت کر سکتے ہیں جن کا دل و دماغ تربیت پا چکا ہے۔ برخلاف اِسکے انبیاء تمام کافۂ انام کو تربیت کرتے ہیں۔ جن کا بہت بڑا حصہ قریب کُل کے محض ناتربیت یافتہ جاہل۔ وحشی جنگلی۔ بدوی بے عقل و بد دماغ ہوتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۵)

(۳۱۳) کبھی ایک ایسی بات کی مثال دی جاتی ہے۔ جو درحقیقت واقع ہو چکی ہے۔ اور کبھی ایک ایسی بات کی بھی مثال دی جاتی ہے۔ جو صرف فرضی ہے۔ اور کبھی واقع نہیں ہوئی۔ مگر اُس کی مثال دینی نہ غلط ہوتی ہے نہ جھوٹ۔ (تفسیر القرآن۔ جلد ۱ صفحہ ۶۲)

(۳۱۴) انسان نے اُن چیزوں کے تجربہ سے جو خدا نے پیدا کی ہیں۔ اُسکی مخلوقات کے قانون فطرت کو معلوم کیا ہے۔ اور بے شبہ وہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اُس نے مخلوقات کے تمام قوانین فطرت کو دریافت کر لیا ہے۔ اُن میں سے بہت سے ایسے محققہ ہیں۔ جو درجۂ یقین کو پہنچ گئے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں۔ جو اب ہی درجۂ یقین کو نہیں پہنچے۔ اور معلوم نہیں۔ کہ ابھی تک کس قدر نامعلوم ہیں۔ (تحریر فی اصول التفسیر صفحہ ۱۴)

سودیشی تحریک

(۳۱۵) ملک کی تجارت اور دولتمندی کا اصول کیا ہے۔ وہ ملک دولتمند نہیں ہوتا جس میں دوسرے ملک کی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ملک دولتمند ہوتا ہے جسکی چیزوں کی تجارت کو دوسرے

علمی

(۳۰۶) ایسے امور بھی ہیں جو کسی مصنف کی لیاقت کا صحیح صحیح اندازہ کرتے وقت دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی مصنف کی دو تصنیفوں میں سے ایک تو بہت بڑا اعلیٰ درجہ رکھتی ہے۔ اور دوسری محض بے حقیقت ہوتی ہے۔ اور اُس کا سبب دونوں تصنیفوں کے موضوع کا مختلف ہونا ہے۔ (خطبات احمدیہ)

(۳۰۷) عقل و فہم کی تعظیم ہم کو اُن لوگوں کے اعمال و اقوال پر عیب رکھنے اور اُن کی بدترین تاویل کرنے سے مانع آتی ہے جنہوں نے تقوےٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت اور عظمت حاصل کی ہو۔ اور اس امر سے بھی البتہ انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر مصنف کو لازم ہے کہ جب اوروں کی تحریرات اور تصنیفات کی چھان بین کرنے کا ارادہ کرے۔ تو اپنے آپ کو تعصب اور کم ظرفی سے پاک اور صاف کرے۔ (ایضاً)

(۳۰۸) ہم بمقتضائے فطرت انسانی یہ بات دیکھتے ہیں۔ کہ تمام ملکاتِ انسانی کسی محرک یعنی کسی امر کے پیش آنے پر اپنا کام کرتے ہیں۔ ہمارے دل میں سینکڑوں مضمون ہوتے ہیں سینکڑوں نصیحتیں ہوتی ہیں۔ اشعار یاد ہوتے ہیں۔ دوستوں کی صورتیں اور مکانوں کی اور باغوں جنگلوں کی تصویریں دماغ میں موجود ہوتی ہیں مگر جب تک اُن پر متوجہ ہونے کا کوئی سبب نہ ہو۔ وہ سب بے معلوم رہتی ہیں۔ (تفسیر القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۵)

(۳۰۹) انسان مطابق اپنی فطرت کے اُن ہی چیزوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اور اُن ہی کا خیال اُس کے دل میں آ سکتا ہے۔ جو اُس نے دیکھی یا چھوئی یا چکھی یا سونگھی یا قوتِ سامعہ سے محسوس کی ہوں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۲)

(۳۱۰) جو کچھ انسان کو بتایا جاتا ہے۔ وہ اُن الفاظ سے تعبیر ہوتا ہے۔ جو انسان کی بول چال میں ہیں۔ اور جو چیز کہ انسان نے نہ دیکھی نہ چھوئی نہ چکھی نہ سونگھی نہ قوتِ سامعہ سے حس کی۔ اُس کے لئے کوئی لفظ انسان کی زبان میں نہیں ہوتا۔ اور اسلئے اُس کا تعبیر کرنا

صانع نے یہ تمام قواء جو انسان کو عطا فرمائے ہیں۔ اُن سے اِس کی مرضی یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ تمام قواء انسان میں اس طرح پر شگفتہ و شاداب رہیں۔ کہ اعتدال سے خارج نہ ہونے پائیں اور ایک دوسرے کے نقیض نہ ہو جاویں۔ انسان کی ذاتی محنت اُسی کیلئے سود مند ہو۔ غلامی کی حالت میں انسان کے بہت سے قوائے بعوض شگفتہ و تر و تازہ رہنے کے پژمردہ بلکہ محض معطل و بیکار ہو جاتے ہیں۔ اُسکی محنت اُسکی سود مندی کیلئے نہیں رہتی۔ پس کسی طرح ایسی حالت صانع کی مرضی نہیں ہو سکتی۔

انسان کی وہ چیز جس سے انسان انسان کہلاتا ہے۔ اور جس کا نام لوگ روح لیتے ہیں مگر اُسکی حقیقت کچھ نہیں بتلا سکتے ایسی شریف چیز ہے کہ کسی کی مملوک ہونیکی لیاقت ہی نہیں رکھتی۔ کیا نتائج قانون قدرت یا خدا کی روح یا امر رب کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے؟ کیا ہم سی ہی ایک مخلوق ہماری ملکیت میں آسکتی ہے؟ حاشا و کلا۔ پس صاف عیاں ہے کہ غلامی اُس قادر مطلق کی مرضی و قانون قدرت دونوں کے برخلاف ہے۔ تمام انسان آزاد اور یکساں پیدا ہوئے ہیں۔ اور کچھ شبہ نہیں۔ کہ زندگی اور آزادی اور خوشی حاصل کرنے میں یکساں اور غیر قابل انتقال استحقاق رکھتے ہیں۔

انگریزوں کی کوششیں جو غلامی کے بند کرنے میں ہوئیں۔ اُن کے ہم دل سے ثنا خواں ہیں اور اِس بات کو بھی قبول کرتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں بھی انگلش گورنمنٹ نے غلاموں کی تجارت بالکل موقوف کردی۔ اور بردہ فروشی بھی بند ہوئی۔ مگر ہم دل سے گورنمنٹ کی کارروائی کے جو ہندوستان میں غلامی کی نسبت ہوئی ہے۔ ثنا خوان نہیں ہیں۔ ہم کو ظن غالب ہے۔ کہ ہندوستان میں درمیان ہندوستانی عملداریوں کے بردہ فروشی جاری ہے اور گورنمنٹ کچھ کافی تدبیر اُس کیلئے نہیں کرتی۔ بعض دفعہ ہم کو خود انگریزی عملداری میں بردہ فروشی ہونے یا لونڈی اور غلام لانیکا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ ہم کسبیوں کے ہاں نئی نئی نوچیوں کا اور ہیجڑوں کے ہاں نئے نئے چیلوں کا اور نوابوں کا ہاں نئے نئے خواجہ سراؤں کا آنا سنتے ہیں۔ ہم دل سے کہتے ہیں۔ کہ اِن سب باتوں کا گناہ ابتک انگریزی گورنمنٹ کے سر پر ہے۔ موجودہ قانون اِن امورات کے تدارک کیلئے کافی نہیں ہے۔ مگر امید ہے۔ کہ کسی دن یہ رسم بد ہندوستان سے بالکل موقوف ہو گی۔ (مضامین تہذیب الاخلاق۔ جلد ۱۔ صفحہ ۵۹)

ایسے ذریعے عورتوں کی تعلیم کے ڈھونڈھتے ہو جس کی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی میں ایسے ذریعوں کی پیروی کرتا ہوں۔ جو قانونِ قدرت کے موافق ہیں۔ (مجموعہ لکچرز صفحہ ۴۱۰)

(۳۰۴) تمہاری نیکی۔ تمہاری بردباری۔ تمہاری محبت ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اُس پر صبر۔ بچوں کی پرورش۔ گھر بار کا انتظام ہمارے فخر کا باعث ہے اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی قسم کا فخر دے سکتی ہے۔ تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔ (حیات جاوید حصّہ ۲ صفحہ ۳۵۴)

غُلامی

(۳۰۵) آزادی اور غلامی میں آپس میں ایسی نقیض ہیں۔ کہ نہ دونوں کا اجتماع ہو سکتا ہے نہ دونوں کا ارتفاع۔ اور اِسلیئے یہ دونوں داخل مرضیٔ پروردگار نہیں ہو سکتیں۔ ورنہ خود پروردگار کی مرضی میں تناقص لازم آویگا۔ جو اُس کی حکمتِ بالغہ کے شایاں نہیں ہے پس کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ اِن دونوں میں سے صرف ایک ہی پروردگار کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ یا یوں کہو۔ کہ قانون قدرت دو نقیضوں کا متقاضی نہیں ہو سکتا۔ اور اِسلئے اُن میں سے ایک ہی مقتضائے قانون قدرت ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انسان ایک ایسی ہستی بنایا گیا ہے۔ جسکی فطرت میں آزادی اور خودمختاری رکھی گئی ہے وہ ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ اُس کو تمام قواء ظاہری و باطنی دیئے گئے ہیں۔ اُن کے استعمال پر جس طرح کہ وہ چاہے۔ قادر ہے۔ تمام کاموں کے شروع کرنیکی سمجھ اور اُن کے انجام کی سوچ اُس کو دی گئی ہے۔ تاکہ ہر کام کا آغاز اور انجام سوچ لے اُس کی فطرت ایسی ہے کہ اپنے لئے تمام چیزیں مہیا کرنے کے لئے حاجت مند ہے۔ پس یہ تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ اِس پُتلے کے صانع کی مرضی یہی تھی۔ کہ یہ پُتلا خود آپ اپنا مالک رہے۔

مردوں کے اخلاق درست ہو گئے ہوں۔ مردوں نے علم و فضل حاصل کر لئے ہوں۔ اور عورتیں تعلیم سے محروم رہی ہوں۔ ہمارا منشاء یہی ہے۔ کہ یہ تعلیم ہم دلا رہے ہیں۔ لڑکوں کی تعلیم نہیں ہے بلکہ لڑکیوں کی ہے۔ جن کے وہ باپ ہونگے۔ ہم کو ولی ہونے کا دعوے نہیں ہے پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہم کو پچھلے واقعات دیکھکر نصیحت پکڑنی چاہئے۔ اِس وقت ہم تمام یوروپ کی اور تعلیم یافتہ ملک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں۔ کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں۔ عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہوں۔ عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں یہی سبب ہے کہ ہم عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے ہیں۔ اِسی کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یوروپ کی تاریخ جانے دو۔ اِس وقت یوروپ میں چلو۔ میں دکھاؤنگا کہ جہاں مردوں کی تعلیم اچھی نہیں۔ وہاں عورتیں جاہل اور اوہام میں مبتلا ہیں۔ کہ وبا کے دور کرنے کو گھوڑے کے نعل دروازوں پر لگاتے ہیں۔ لیکن جہاں کے مرد تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں۔ وہاں کی عورتیں بھی تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں۔ خود ہندوستان کا حال دیکھو۔ کہ کتنے خاندان جو ذی علم تھے۔ اُن خاندانوں کی عورتیں کیسی تعلیم یافتہ تھیں۔ اگر تم کو ہندوستان کا حال معلوم ہے۔ تو بتلاؤ۔ کہ اُن خاندانوں کی عورتیں کیوں پڑھی اور لکھی ہوتی تھیں۔ ایک نہایت اچھی مثل ہے۔ کہ "خدا کی برکت زمین سے نہیں آتی۔ بلکہ آسمان پر سے اُترتی ہے" سورج کی روشنی بھی نیچے سے نہیں آتی۔ بلکہ اوپر سے آتی ہے۔ اِسی طرح مردوں کی تعلیم سے عورتوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ الزام کہ میں عورتوں کی تعلیم سے کنارہ کش ہوں محض غلط ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ میری رائے میں عورتوں کی تعلیم کا ذریعہ مرد ہی ہوں گے۔ اگر مردوں کو تعلیم نہ ہو۔ تو نہ اُستانیاں ہوں گی نہ کوئی سامان عورتوں کی تعلیم کا ہوگا۔ جب مرد لائق ہو جاویں گے۔ سب ذریعے پیدا کر لیں گے۔ گھر کی عورتیں بھی لائق ہو جاویں گی۔ اور اُستانیاں بھی پیدا ہو جاوینگی۔ میرے صرف دو مطلب ہیں جن کو میں پھر بیان کرتا ہوں۔ اول یہ خیال۔ کہ میں مخالف عورتوں کی تعلیم کا ہوں غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ ذریعہ عورتوں کی تعلیم کا سوائے اِس کے اور کوئی نہیں ہے۔ کہ مردوں کی تعلیم ہو۔ اور اِس لئے اِسی میں مَیں کوشش کرتا ہوں۔ کہ بچوں کی تعلیم ہو۔ جب وہ تعلیم یافتہ ہو جاویں گے۔ اپنی بیٹیوں اور بچوں اور عورتوں کو تعلیم سے آراستہ کر لیں گے تم

نہایت ناپسند کرتے ہونگے۔ کیونکہ کوئی مسلمان یا ہندو اِس بات سے خوش نہ ہوگا کہ یتیم لاوارث
بچے ہندو یا مسلمان کے ایسی بیرحمی سے عیسائی بنائے جاویں۔ پس میں نہایت عجز و انکسار اور
دلی جوش حب الوطنی سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ کہ **خدا**
کے واسطے۔ رام جی کے واسطے اپنی قوم کے یتیم اور لاوارث بچوں پر رحم کرو۔
اور اُن کی پرورش کیلئے اُن تدبیروں میں میرے ساتھ شریک ہو جو مدت ہائے دراز سے
میں نے سوچی ہیں۔ اور جن کے پورا کرنے کی میری کمال آرزو ہے۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۲۲۵)

تعلیم و تربیتِ نسوان

(۳۰۱) کچھ شبہ نہیں۔ کہ قومی تہذیب و شائستگی کیلئے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضرور ہے پس
ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اور اُن کو دستکاری سکھانے کے لئے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیئے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۵)
(۳۰۲) عورتوں کی تعلیم کے لئے مدرسوں کا قائم کرنا اور یوروپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید
کرنا ہندوستان کی موجودہ حالت کے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اور میں اُس کا سخت مخالف
ہوں۔ لوگوں نے یہ بات سُنی ہے۔ کہ انگلستان میں لڑکیوں کی تعلیم کیلئے مدرسے ہیں۔ اور وہ
اُسی طرح اُن میں جمع ہو کر پڑھتی ہیں جس طرح کہ لڑکے مدرسوں میں جمع ہو کر پڑھتے ہیں اور رہتے
ہیں۔ میں نے بتخصیص لنڈن میں بعض اپنے دوستوں کی مہربانی سے ایسے زنانہ مدرسوں کو
جہاں اشراف لڑکیاں پڑھتی اور رہتی تھیں۔ دیکھا ہے۔ آپکو یقین دلاتا ہوں کہ جو حالت
عمدگی اور طمانیت اور تعلیم و تربیت کی اُن مدرسوں میں ہے۔ ہندوستان کو وہاں تک پہنچنے کیلئے
اب ہی سینکڑوں برس درکار ہیں۔ اگر فرض کرو۔ کہ ایسے مدرسے ہندوستان میں ہوں۔ تو
میں ہر اشراف خاندان سے کہوں گا کہ بے شک اپنی لڑکیوں کو وہاں بھیجو۔ لیکن اے دوستو! میں
آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ ہندوستان میں اب ہی ایسا ہونا محالات سے ہے۔ (مجموعہ لکچرز۔ صفحہ ۳۲۹)
(۳۰۳) کوئی دنیا کی تاریخ اِس وقت نہیں ملتی۔ کہ جن خاندانوں کے مردوں نے تعلیم پائی ہو

کچھ ٹھکانا نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ کوئی ایسی تدبیر نہیں کرسکتی۔ نہ ایسا خرچ اختیار کرسکتی ہے۔ جس کے ذریعہ سے اُن کی پرورش اور نیز اُن کی تعلیم ہو۔ اور اسلئے گورنمنٹ ایسے یتیم لاوارث بچوں کو اُن لوگوں کے سپرد کردیتی ہے۔ جو اُن دونوں یعنی اُن کی پرورش اور اُن کی تعلیم ضروری کے ذمہ وار ہوں۔

پادری صاحبان جو ہمارے ملک میں ہر جگہ موجود ہیں۔ اور عیسائی قومیں اپنے مذہب کی ترقی کے لئے لاکھہا روپیہ چندہ کرکر اُن کو دیتی ہیں۔ اُن کو ایسے یتیم ولاوارث بچوں کے عیسائی بنالینے کا خوب موقع ملتا ہے۔ اور وہ اُن کی پرورش اور تعلیم کے ذمہ وار ہوتے ہیں اور لیجاتے ہیں۔ اور فی الفور اُس معصوم بچے کو اصطباغ دیکر عیسائی بنالیتے ہیں۔ اور اب بسبب حادثات پے درپے اس امر ناواجب اور نامناسب کی ایسی کثرت ہوگئی ہے۔ کہ قحط کے یتیم اور لاوارث عیسائی کئے ہوئے بچوں سے گاؤں کے گاؤں آباد ہوگئے ہیں۔ اگر جوان عاقل و بالغ آدمی کسی مذہب کا عیسائی ہوجاوے۔ یا مسلمان ہوجاوے۔ تو کوئی الزام یا افسوس کی بات نہیں ہے۔ مگر صغیر السن یتیم لاوارث بچوں کو ایسی مصیبت و رحم کی حالت میں عیسائی کرلینا جسکے سبب سے وہ اپنی تمام قوم و برادری اور رشتہ داروں سے مثل مُردہ کے منقطع ہوجاتے ہیں۔ اور تمام عمر کیلئے اُس خوشی سے جو اپنی قوم میں شامل رہنے سے ہوتی ہے مجبوراً بلا اپنی مرضی کے محروم ہوجاتے ہیں۔ نہایت افسوس اور نہایت نفرت کے لائق بات ہے۔ اور رحم اور انسانیت اور نیکی اور نیک دلی سے نہایت بعید ہے۔ اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ وہ ہرگز یتیم بچوں پر رحم نہیں کرتے۔ بلکہ خود غرض متصور ہوتے ہیں۔ اور درحقیقت اُن یتیم بچوں پر اُن کی بیکس حالت میں ظلم کرتے ہیں۔ جو بغیر اُن کی مرضی جائز کے اُن کو ہمیشہ کے لئے اُن کی قوم سے منقطع کردیتا ہے۔ جو شخص رحمدل ہوگا۔ اور یتیم بچوں پر بغیر کسی نفسانی خواہش کے صرف اِس وجہ سے رحم کرتا ہوگا کہ بمقتضائے انسانیت اُن پر رحم واجب ہے وہ ایسے فعل کو جیسا کہ اب ہورہا ہے۔ اور جس پر پادری صاحبان کا عملدرآمد ہے۔ اور جس کا ظہور ایک نہایت سختی اور بیرحمی کے ساتھ مدراس کے قحط میں پادری صاحبان کی جانب سے ہوا ہے۔ جو اخباروں میں مندرج ہے۔ نہایت بیرحمی تصور کرتا ہوگا۔ اور جو لوگ ہر ایک کام کو بہ نظر ثواب عقبیٰ کیا کرتے ہیں۔ وہ بھی اِس بات کو

ہونا چاہئے۔ جیسے کہ دش اور تین کی زیادتی وکمی کا یقین ہے۔ تاکہ کسی طرح زائل نہ ہو سکے۔ کیونکہ اگر وہ کسی طرح زائل ہو گیا۔ تو وہ حقیقت میں علم یالیقین نہ تھا۔ بلکہ محض ایک دھوکہ تھا۔

اِن تمام خیالات نے مجھ کو گھیر لیا۔ اور میں چاروں طرف ڈھونڈھنے لگا کہ علم یالیقین بلکہ یوں کہو۔ کہ ایمان حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

اِن سب مباحثوں کے بعد میں نے یقین کیا۔ کہ علم یالیقین یا ایمان حاصل کرنیکا وسیلہ صرف عقل ہے۔ جو اُن چیزوں کے حاصل کرنے کیلئے آلہ اور نہایت عمدہ رہنما ہے۔

کسی طرف جاؤ۔ کہیں سے پھیر کھا کر آؤ۔ علم یالیقین یا ایمان کا مدار صرف عقل ہی پر رہتا ہے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۲۰)

(۲۹۹) دیوتاؤں کی پرستش کا مذہب ایک طول طویل قصہ ہے۔ جو شاعری اور ولولوں سے بھرا ہوا ہے اور وہ ایک ایسی چیز ہے جس سے جو انسان کے دلی خیالات اور ارادوں اور اُن عجائب چیزوں سے مرکب ہے۔ جو خدا کی شان سے متعلق ہیں۔ اِسی مذہب کی بدولت اُن شاعروں کی طبیعت میں خیال بندی کا ولولہ پیدا ہوا۔ اور ایسی قوت حاصل ہوئی۔ جس کے سبب سے انہوں نے ایک خیالی دنیا قائم کی۔ اور اِسی قوت کے ذریعہ سے وہ وہ فنون ایجاد کئے گئے جن کے سبب سے مصر اور کالڈیا اور یونان اور اٹلی کو نہائت زیب و زینت حاصل ہوئی۔ اور انہیں فنون سے وہ شائستگی ثابت ہوتی ہے۔ جو کسی زمانہ میں اُن ملکوں کے اندر ہو گی۔ (مجموعہ لیکچر صفحہ ۱۸۷)

قحط سالی اور یتیم بچے

(مجھے جس طرح یہ گوارا نہیں کہ ایک سید کا بچہ مشنریوں کو دیا جائے۔ اُسی طرح یہ بھی گوارا نہیں۔ کہ ایک چمار کا بچہ اُن کو دیا جائے)

(۳۰۰) ہندوستان میں قحط کی بلا اکثر آتی ہے۔ اور خصوصاً اِس بلا میں اور نیز دیگر واقعات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے صغیر السن بچے۔ یتیم اور لاوارث رہ جاتے ہیں جن کی پرورش کا

(۲۹۳) ظاہری اعمال کا روح پر جب ہی اثر ہوتا ہے۔ جب اُن کو روحانی نیکی کا یاد دلانے والا سمجھے۔ اور اگر صرف اِن ظاہری اعمال ہی کو مقصودِ اصلی سمجھ لے۔ تو روحانی تربیت معدوم رہتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۵)

(۲۹۴) ایک اعلیٰ درجہ کے شخص کو اُسکے بچپنے کی بھولی بھولی باتیں یاد دلائی جاتی ہیں۔ اور پھر اُن کمالوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو اِس نے حاصل کیا ہے۔ اِن دونوں زمانوں کی باتیں مل کر نہایت دلچسپ اور پُر اثر ہو جاتی ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۳۲)

(۲۹۵) بچپن سے باتوں کو سنتے سنتے اُن کا نقش کالحجر دل میں ہو جاتا ہے جس کا مٹانا بہت ہی زبردست دل۔ اور نہایت ہی قوت ایمانیہ کا اور بہت ہی غور و فکر کا کام ہے۔ آبائی خیالات کو اور خصوصاً ایسے خیالات کو جو مذہبی روایتوں پر مبنی ہیں چھوڑنا نہایت مشکل ہے۔ (تحریر فی اصول التفسیر صفحہ ۷-۸)

(۲۹۶) جہاں اور بہت سے عجائبات قدرتِ الٰہی میں ہیں۔ اُن ہی میں سے انسان کے خیالات بھی نہایت عجیب ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایک قسم کی مخلوقات ایک ہی سا خیال رکھتی ہے۔ جانوروں کی وہ حرکات اور افعال جو جاندار ہونیکے سبب سے ہیں۔ اور وہ چیز جو محرک اُن افعال یا حرکات کی بواسطہ یا بلاواسطہ ہے۔ اُس کا کچھ ہی نام رکھو مگر وہ وہی چیز ہے۔ جسکو انسانی حالت میں خیال کہتے ہیں۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲۔ صفحہ ۱۸)

(۲۹۷) تمام افعال اور حرکات جانوروں کے بلاشبہ ارادی ہیں۔ اور کچھ شک نہیں۔ کہ وہ متحرک بالارادہ نہیں۔ اُن کی تمام حرکتوں کا باعث بواسطہ یا بلاواسطہ ایک خیال جلب منفعت مادی جیسے غذا اور مسکن وغیرہ یا غیر مادی جیسے فرحت و انبساط اور بشاشت یا خیالِ دفع مُضرت مادی و غیر مادی کا ہوتا ہے۔ ہم نہیں پاتے کہ انسان میں اور کوئی چیز اِس سے زیادہ ہے۔ بلاشبہ اتنا فرق پاتے ہیں۔ کہ جانور میں وہ خیالات محدود اور انسان میں نامحدود ہیں۔ (ایضاً)

(۲۹۸) علم اور یقین دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جس چیز کا جس کو علم ہوگا۔ بیشک اُس کا یقین بھی ہوگا۔ اور جس کا یقین ہوگا۔ اُس کا علم بھی ہوگا۔ پس میں نے خیال کیا کہ یقین بغیر علم کے اور علم بغیر یقین کے سچا اور پورا نہیں۔

میں نے یہ بھی خیال کیا۔ کہ علم یا یقین جس کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہی

(۲۸۹) ہر ایک شخص ظاہر داری کے لئے دوسرے مذہب کی جس کو کہ وہ حق نہیں سمجھتا چھوٹی باتوں میں منافقانہ طور پر شریک ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی ایسی بات میں جو ایک امر عظیم ہو اور خاص عبادت سے علاقہ رکھتا ہو اور ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہونیکی بطور ایک نشانی کے ہو۔ اُسکو بطور ایک نفاق کے ادا کرنے سے بالطبع نفرت اور پرہیز کرتا ہے۔ اور جب تک کہ دل ہی سے اُس دوسرے مذہب کو نہ قبول کر لیا ہو۔ اُسوقت تک اُس کو ادا نہیں کرتا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۹۹)

(۲۹۰) انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے۔ تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے۔ جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں اور سُننے پڑھنے والے خیال کرتے ہیں۔ کہ یہی اصول اخلاق اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ ہوا کی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے۔ اور جو کہ وہ اصول فطرتِ انسانی کے بلکہ قانون قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں کبھی اُن پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ ایسے قانون بنانے سے جس پر کبھی عمل درآمد نہ ہو سکے۔ کوئی نتیجہ اور فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ بلکہ دل میں اُس قانون کی حقارت بیٹھتی ہے۔ کہ وہ قانون قدرت کے برخلاف ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۴۹)

(تفسیر القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۸۱)

(۲۹۱) فطرتِ انسانی میں یہ بات ہے۔ کہ جو سچا شبہ اُس کے دل میں ہوتا ہے۔ وہ دور کرنیسے دور نہیں ہوتا۔ اور یقین بٹھلانے سے یقین نہیں بیٹھتا۔ بلکہ وہ شبہ جب ہی دور ہوتا ہے۔ جب حقیقتاً دور ہو جائے۔ اور یقین جب ہی آتا ہے۔ جبکہ حقیقتاً یقین آ جائے۔ ایسی حالت میں کوئی شخص ایسی بات کرنے پر فطرتاً آمادہ نہیں ہو سکتا۔ جو اُس کے دل میں کھٹکنے والے شُبہ کے برخلاف ہو۔

(۲۹۲) خدا تعالےٰ نے انسان کو ایسی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ کہ وہ جو کچھ آنکھ سے دیکھتا ہے کان سے سنتا ہے۔ ناک سے سونگھتا ہے۔ زبان سے چکھتا ہے۔ ہاتھ سے چھوتا ہے۔ اُس کا اثر اُس کے دل پر پہنچتا ہے۔ اور ایک خیال اُس میں پیدا ہوتا ہے۔ جو اُس کے اخلاق پر اثر کرتا ہے۔ انسان کے دل سے نکلنے والے چیزوں کی بہ نسبت وہ چیزیں بہت ہیں جو باہر سے انسان کے دل میں جاتی ہیں۔ بلکہ ٹھیک ٹھیک یوں کہنا چاہئے۔ کہ جو کچھ انسان کے دل سے نکلتا ہے وہ وہی ہے۔ جو باہر سے اُس کے دل میں جاتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۸۴)

مقتضی ہوتی ہے۔ اُس کے خیال میں قرار پاتی ہے۔ اور پھر وہ اِس بات کو تو بھول جاتا ہے کہ میں اس مخلوق کو نہیں جانتا۔ نہ میں نے اُس کو کبھی دیکھا ہے۔ اور یوں جاننے لگتا ہے۔ کہ وہ مخلوق وہی ہے۔ جو میرے خیال میں ہے۔ اور جب وہ خیال لوگوں میں نسل درنسل چلا آتا ہے تو ایسا مستحکم ہو جاتا ہے۔ کہ گویا اُس میں شک وشبہ مطلق ہے ہی نہیں۔ (تفسیر القرآن جلد ا۔ صفحہ ۵۱)

(۲۸۵) جس طرح انسان سے فروتر مخلوق کا ایک سلسلہ ہم دیکھتے ہیں۔ اُسی طرح انسان سے برتر مخلوق ہونے سے انکار کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ شاید کہ ہو۔ گو وہ کیسی ہی عجیب اور ناقابل یقین ہو۔ مگر ایسی خلقت کے درحقیقت موجود ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ اِس بات کا ثبوت کہ ایسی خلقت ہے۔ نہیں ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۵)

(۲۸۶) انسان ایک مجموعہ قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی کا ہے۔ اور اِن دونوں قوتوں کے بے انتہا ذریات ہیں۔ جو ہر ایک قسم کی نیکی و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور وہی انسان کے فرشتے اور اُن کی ذریات اور وہی انسان کے شیطان اور اُس کی ذریات۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۶)

(۲۸۷) انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے کی خواہش تین طرح پر پیدا ہوتی ہے۔

اُس کا حال اور اوصاف سُننے سے۔ یا

دل میں کسی خاص قسم کا ذوق وشوق پیدا ہو جانے سے۔ یا

اُس کا حال کہنے والے کی بات پر یقین نہ کرنے سے۔ (ایضاً۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۰۶)

(۲۸۸) انسان کی ایک جبلی عادت ہے۔ کہ ایک ایسے وجود کیلئے جو نہ دکھائی دیتا ہے۔ نہ چھوا جاتا ہے۔ اور نہ سمجھ میں آتا ہے۔ اور بجز اِس کے کہ ہے۔ اور کوئی خیال اُس کی نسبت قائم نہیں ہو سکتا۔ کوئی نہ کوئی محسوس نشان قائم کر لیتا ہے۔ اور اُس محسوس نشان کے ذریعہ سے اپنا عجز اور نیاز اُس غیر محسوس اور بیچوں و بیچگوں ذات کے سامنے ادا کرتا ہے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کو بالطبع ایسے نشان کے قائم کرنیکی زیادہ تر رغبت ہوتی تھی۔ اور یہی بات ہے جس کے سبب سے ہم قدیم سے قدیم قوموں کا اور وحشی سے وحشی لوگوں کا جب حال تحقیق کرتے ہیں۔ تو اُن میں بُت پرستی کے یعنی ایک شئے محسوس کے پوجنے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ (تفسیر القرآن جلد ا صفحہ ۱۸۷)

اُن کے دماغ عالی ہوتے گئے۔ اور اُن کی خوشیاں زیادہ پاک اور شائستہ ہوتی گئیں۔ (ایضاً)

(۲۸۰) تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہی غیر منتہیٰ اور کامل ذات ہو ضرور ہے۔ کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے جس طرح کہ اُس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت سے خارج کر دینا محال ہے اُسی طرح سے یہ بھی ممکن ہے۔ کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لئے دو متناقض اصول اور احکام اُس کی ذات سے صادر ہوں۔ (ایضاً)

(۲۸۱) پرانی باتوں کیساتھ ہمیشہ قصّے و کہانیاں لوگ ملا دیتے ہیں۔ اُن کو مقدس و متبرک بنانے کو ایسے ایسے واقعات اُن کیساتھ منسوب کرتے ہیں۔ جنکی کچھ بھی اصل نہیں ہوتی۔ (ایضاً)

(۲۸۲) ایک امور خارجیہ کے سبب سے جبکہ قومی و ملکی و تمدنی امور کی الف و موانست کا اور بچپن سے کسی امر کی ممارست و تربیت و صحبت کا اُس پر ایسا قوی اثر ہوتا ہے۔ کہ وہ اُن ہی افعال کو مستحسن سمجھتا ہے۔ اور اُن ہی کے کرنے پر اُس کا دل اُس کو مجبور کر دیتا ہے۔ گو یہ مجبوری اکثر اسکی سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ بظاہر اُس پر کسی کا جبر نہیں ہوتا۔ مگر درحقیقت اُن ہی قومی و ملکی و تمدنی اور بچپن سے کسی امر کی ممارست و تربیت و صحبت کا اثر رفتہ رفتہ بے معلوم اُس میں ایسا سرایت کر جاتا ہے۔ کہ جس سے اُن افعال کے کرنے پر جن کو وہ کرتا ہے مجبور ہوتا ہے۔ اور جن باتوں کو وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے کرتا ہوں۔ درحقیقت وہ اُس قومی اثر کے سبب سے بمجبوری کرتا ہے۔

(تفسیر القرآن جلد (۱) صفحہ (۲۱))

(۲۸۳) دوسری قسم کی مجبوری اپنے افعال میں خود انسان کو اپنی خلقت کے سبب ہوتی ہے ہم تمام دنیا کی چیزوں میں ایک فطرت پاتے ہیں جس کے برخلاف ہرگز نہیں ہوتا پس وہ سب اُن افعال کے سرزد ہونے میں جو اُن سے منسوب ہیں۔ بمقتضائے اپنی خلقت کے مجبور ہیں۔ اور تمام تفاوت انسانوں میں فطرت کے باعث سے ہیں۔ اور جو افعال کہ اِس فطرت پر مبنی ہیں۔ اُن کے صادر ہونے میں وہ مجبور ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۲)

(۲۸۴) انسان کی یہ ایک طبعی بات ہے۔ کہ جب کسی ایسی مخلوق کا ذکر ہو جس کو وہ نہیں جانتا تو خواہ نخواہ اُس کے دل میں اُس مخلوق کے ایک جسمانی جسم متحیز کا جس کے رہنے کی کوئی جگہ بھی ہو خیال جاتا ہے۔ پھر اُن کے اوصاف پر خیال کرتے کرتے اُن کی ایک صورت جو اُن اوصاف کے

کا جوش۔ سمندروں کا تلاطم۔ پہاڑوں کے عجائبات۔ درختوں کی کرامات۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ بجلی کی کڑک اور چمک۔ اور اُس کے گرنے سے بربادی اور خوفناک طوفانوں کی تباہی کے اسباب سے محض ناواقف تھے۔ اسلئے اُنھوں نے اِن سب کاموں کو کسی ایسے وجود کے کام تصور کئے ہونگے جسکو وہ اپنے آپ سے بدرجہا اعلیٰ۔ زبردست اور بوجہ غیر ظاہر ہونیکے اُس وجود کے اور بھی زیادہ خوفناک تصور کرتے ہوں گے۔ یہی اسباب ہیں جن کے سبب ابتدا میں انسان کے دل میں عبادت کرنے اور قربانیاں چڑھانے اور پوجا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ (خطبات احمدیہ)

(۲۷۶) انسان کی جبلت میں جو ہر ایک چیز کے سمجھنے کی طاقت ہے۔ اور جسکو ہم سمجھ یا عقل سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اُس کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ وہ اپنے وجود کی نہایت ابتدائی منزل میں اول بتوں کی پرستش کا اپنے ذہن میں خیال پیدا کرے۔ اِس سبب سے اولاً اُس کے ذہن میں بتوں کی پرستش کا خیال پیدا ہوا۔ اور پھر رفتہ رفتہ قائم و مستحکم ہوگیا۔ (ایضاً)

(۲۷۷) طبعی اسباب کا تصور تو بہت تھوڑے عرصہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابتدائی انسان صرف ایک قسم کی علت کا گمان کرسکتا ہے یعنی مثل اپنی ایک با ارادہ طبیعت کا۔ اسلئے وہ تمام چیزوں کو جنھیں متحرک اور عمل کنندہ پاتا ہے۔ ذی روح اور ذی فہم وجود ٹھہرا لیتا ہے۔ اور اُنکی طرف مثل انسانوں کے خیالات اور طبائع منسوب کرتا ہے۔ اور اِس سے زیادہ کیا قرین قیاس ہوسکتا ہے کہ بذریعہ نذروں اور التجاؤں کے اُن کے مہربان کرنے یا اُن کی بدمزاجی اور غصہ کے دور کرنے کے واسطے کوشش کرے۔ (ایضاً)

(۲۷۸) بت پرستی کی ایک اور بنا کسی قوم کے کسی شخص کی جذبات کی جو اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ سے مشہور و معروف ہوا۔ محبوبیت کی خواہش تھی یعنی ایسے کارہائے نمایاں جو شاعروں کے وحشیانہ گیتوں اور نظموں میں مشہور ہوئے۔ اور مرنے کے بعد اُس شخص کو معبود ہونے کے رتبہ کا صلہ دلایا۔ (ایضاً)

(۲۷۹) جبکہ زمانہ بڑھتا گیا۔ جبکہ تہذیب و شائستگی کو ترقی ہوتی گئی۔ جبکہ باہمی راہ و رسم کے ذریعے زیادہ شائع اور پرامن ہوتے گئے۔ جبکہ آدمیوں کو ایک دوسرے سے ملاقی ہونے کا زیادہ اتفاق ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اپنے خیالات۔ اپنی رائیوں۔ اور اپنے عقاید کا تبادلہ کرنے کے قابل ہوئے۔

کام ہوتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۷۴)

(۲۷۱) زمانہ انسان پر سب سے بڑا اثر ڈالنے والا ہے۔ وہ انسان کے خیالات۔ اعتقادات۔ رسم و رواج کو اپنے پوشیدہ پوشیدہ اثروں سے جو معلوم نہیں ہوتے۔ بدلتا جاتا ہے۔ دن وہی ہتا ہے۔ رات وہی ہتی ہے۔ سورج ایک ہی طرح نکلتا ڈوبتا ہے۔ چاند ایک ہی طرح پر گھٹتا بڑھتا ہے۔ ستارے جس طرح پر چمکتے تھے۔ اُسی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ پھر کیا چیز نئی ہوتی ہے جس سے اگلی چیزیں بدلتی ہیں اور دقیانوسی کہلاتی ہیں اور نئی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور انسانوں میں پھیلتی ہیں۔

اِس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جن چیزوں سے زمانہ گنا جاتا ہے۔ اُن میں تو کچھ تغیر نہیں ہوتا مگر خود انسان کے خیالات اور اُسکے معلومات میں ترقی ہوتی جاتی ہے نئے نئے علوم و فنون نکلتے آتے ہیں۔ اور انسان پر مؤثر ہوتے ہیں اور چونکہ وہ سب کسی نہ کسی زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے مجازاً زمانہ کے اثر سے اُس کو تعبیر کرتے ہیں۔ (تہذیب الاخلاق جلد۔ ا۳۱۱ھ صفحہ۔ ۱۴۲)

(۲۷۲) جس طرح دنیوی خیالات۔ عادات اور رسم و رواج۔ حالت تمدن اور معاشرت پر زمانہ مؤثر ہوتا ہے۔ اُسی طرح مذہب و اعتقاد پر بھی زمانہ کا اثر پڑتا ہے۔ (ایضاً)

(۲۷۳) ایک زمانہ یقین کا زمانہ کہلاتا ہے۔ کہ جو بات کہی جاتی ہے۔ گو وہ کیسی ہی عجیب ہو۔ اُس پر سب کو یقین ہوتا ہے۔ مگر حال کا زمانہ وہ زمانہ نہیں ہے بلکہ شک کا زمانہ ہے۔ کوئی بات ہو۔ جب تک اُسکے سچ ہونیکا یقین نہ آوے سچ نہیں مانی جاتی۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ انسانوں کے مذہب پر یا یوں کہو کہ اُنکے اعتقادات پر زمانہ نے سب سے بڑا اثر ڈالا ہے۔ (ایضاً)

(۲۷۴) عبادت اور پرستش کی سادگی اور یکرنگی خود بخود اُس وقت تک جاری رہی ہوگی جبکہ انسان تعداد میں کم اور ایک محدود مقام میں تھے مگر جبکہ وہ زیادہ وسیع ملکوں میں پھیل گئے جنکی آب و ہوا اور ملک کی بناوٹ مختلف تھی۔ تو اُس وقت اُنکے دلوں کو نئے اور عجیب خیالات نے قریباً ہر ایک بات کی نسبت گھیر لیا خصوصاً اُس وجود کی ماہیت کی نسبت جسکی عظمت کے جلوے نیک یا بد خوف و ہراس سے اُنکو تسلیم کرنے پڑے۔ (خطبات احمدیہ)

(۲۷۵) وہ لوگ اُن قدرتی ظہور کے طبعی اسباب سے جن کے دیکھنے سے ایک تربیت یافتہ آدمی کے دل میں بھی خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے۔ جیسے کہ بھونچالوں کا آنا۔ زمین کا دھنس جانا اور پھٹ جانا دریاؤں

فلسفیانہ

(۲۷۶) ہمارے خیالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو خود ہماری طبیعتوں نے پیدا کیا ہو۔ یا اسباب غیر محققہ خیالیہ سے ہم میں پیدا ہوئے ہوں۔ بلا شبہ اس قسم کے خیال کے مفہوم میں امکان اس بات کا کہ بعد تجربہ کے مطابق واقع کے ہو یا نہ ہو۔ داخل ہے۔ مگر ہمارے خیالات جو دوسری قسم کے ہیں جنکو نہ از خود ہماری طبیعتوں نے پیدا کیا ہے۔ اور نہ وہ اسباب غیر محققہ خیالیہ سے ہم میں پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ انکو کسی دوسرے حقائق محققہ نے پیدا کیا ہے وہ ہمیشہ ہوتے ہیں اور بالکل مطابق واقع کے۔ بعد تجربہ کے۔ (تہذیب الاخلاق ۱۸۹۴ صفحہ ۱۰۵)

(۲۷۷) یہ سچ ہے۔ کہ زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا کبھی خوش نصیبوں کو بد نصیب کر دیتا ہے اور کبھی بد نصیبوں کو خوش نصیب۔ مگر ہر ایک تغیر و تبدل کے آثار شروع ہو جاتے ہیں جس سے آئندہ کے نتیجہ کی پیشینگوئی کی جا سکتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۰)

(۲۷۸) سچی رائے میں بھی کوئی ایسی کرامات نہیں ہوتی۔ کہ وہ از خود لوگوں کے دل میں بیٹھ جاوے۔ اس میں جو کچھ کرامات ہوتی ہے وہ صرف اسی قدر ہوتی ہے۔ کہ مباحثہ کا اسکو خوف نہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۵۱)

(۲۷۹) میرا خیال ہے کہ اگر انسانوں کے دلوں کو چیر کر اُن کا حال دیکھا جاوے۔ تو دانا اور ناداں دونوں کے دلوں میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق نکلے دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بہت سے لغو اور بیہودہ خیال آتے ہیں بیشمار وسوسے دونوں کے دلوں میں اٹھتے ہیں۔ مگر اُن دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ دانا آدمی اُن میں سے انتخاب کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کون خیالات ایسے ہیں جنکو گفتار میں لانا چاہئے۔ اور کون سے ایسے ہیں جنکو چھوڑ دینا چاہئے ناداں آدمی ایسا نہیں کرتا۔ اور جو خیال اُس کے دل میں آتا ہے۔ بے سوچے سمجھے مُنہ سے بکتا جاتا ہے دانشمند آدمی بھی دوستوں کیساتھ بات چیت کرنے میں ناداں کی مانند ہوتا ہے۔ جو اُس کے دل میں آتا ہے بے تردد دوست سے کہتا ہے۔ گویا اُس کو خیالات ہی بلند آواز میں آتے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۶۸)

(۲۷۰) سچ ہے۔ کہ انسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں۔ اور جس قدر کم و بیش عقل کی ہدایت انکو ہوتی ہے۔ اور جس قدر کہ عقل اُن جوشوں کو درست کرتی ہے۔ اُسی قدر مختلف طور پر اُن سے

کو وسعت دیتا ہے۔ اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے۔ تاکہ نئے لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو۔ یہی حال اس قسم کے اور لفظوں کا ہے۔ اگر ہم اُن سب کی تفصیل لکھیں۔ تو ہمارا یہ آرٹیکل لغت یا اصطلاحات کی ایک کتاب ہو جاوے اِسی نمونہ سے ہمارے ہموطن خیال کریں گے۔ کہ ہماری قوم کو اپنی زبان کی نسبت بھی کیا کیا کرنا ہے۔ اور اِن لغو خیالات کو چھوڑیں گے۔ کہ وہ شخص تو انگریزیت پر مرتا ہے۔ انگریزی ہی لفظ بولتا ہے۔ اپنی واقفکاری انگریزوں کی جتاتا ہے۔ کیونکہ کسی جنٹلمین کو ایسے ذلیل خیالات کسی جنٹلمین کی نسبت کرنے زیبا نہیں۔ (ایضاً)

(۲۷۳) میں نے جو ہر مقام پر "اپنی زبان" کے لفظ کا استعمال کیا تو "اپنی زبان" سے میری مراد کیا ہے۔ میں "اپنی زبان" سے وہ مراد لیتا ہوں۔ جو کسی ملک میں اِس طرح پر مستقل ہو۔ کہ ہر شخص اُسکو سمجھتا ہو۔ اور وہ اُس میں بات چیت کرتا ہو خواہ وہ اُس ملک کی اصلی زبان ہو یا نہ ہو۔ اور اسی زبان پر میں ورنیکلر کے لفظ کا استعمال کرتا ہوں۔ (مجموعہ لکچرز۔ صفحہ ۴۵)

(۲۷۴) ہندوستان میں فارسی زبان نے عموماً لوگوں کی تہذیب اور حسن معاشرت اور علم مجلس اور تمام امور میں جو انسان کے دماغ اور خیالات سے متعلق ہیں۔ بہت کچھ ترقی دی ہے۔ اور اس کا علانیہ ثبوت اُن لوگوں میں مقابلہ کرنے سے پایا جاتا ہے جنہوں نے فارسی زبان کو تحصیل کیا ہے۔ اور جنہوں نے اُسکو تحصیل نہیں کیا گو کہ وہ دوسری زبان میں کیسا ہی بلند درجہ رکھتے ہوں۔ (مجموعہ لکچرز۔ صفحہ ۳۸۹)

(۲۷۵) لٹریچر ایک ایسا علم ہے۔ جو ہر ایک زبان کیساتھ مخصوص ہے۔ مگر اس زمانہ میں اُس میں بھی طریق بیان اور طرز ادائے مضمون نے ایسی ترقی کی ہے۔ کہ ہم اپنی قدیم طرز تحریر اور طریق ادائے مضمون کے چھوڑنے اور اِس جدید طرز کے اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں لفاظی اور ہجر و وصل کی شاعری مبالغہ۔ اور اُن تحریر پُر مرح سرائی صنائع و بدائع جو ایک زمانہ میں حسن تحریر سمجھے جاتے تھے اب حد سے زیادہ معیوب ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۴۶۱)

(۲۷۱) لٹریچر یعنی علم ادب اہل زبان کیلئے نہایت وسیع جولانگاہ ہے۔ اُس میں وہ اپنی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے اُس کے ذریعہ سے وہ اپنے دل کی بات دوسروں کے دل میں ڈالتا ہے۔ اپنی شستہ تقریر اور مناسب مناسب الفاظ سے لوگوں کے دلوں کو جس بات پر چاہتا ہے اُبھارتا ہے۔ اُن ہی لفظوں سے کبھی ہنسا دیتا ہے۔ کبھی رُلا دیتا ہے پُرانے دقیانوسی خیالوں کو مٹاتا ہے۔ اور نئے نئے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے کبھی واحد کے بدلے جمع اور جمع کے بدلے واحد کے صیغے بولتا ہے اور کبھی حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر کہدیتا ہے۔ کبھی ترکیب جملہ کی دوسری زبان کی ترکیب پر گھڑ دیتا ہے! اور اِس سب میں ایک لطف اور ایک قسم کا مزا رکھتا جاتا ہے۔ اگر وہی چال وہ چلے۔ جو اہلِ زبان نہیں ہے۔ تو سینکڑوں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اہلِ زبان جو کچھ کہے سو صحیح ہے۔ اور غیر اہلِ زبان وہ چال چلے تو غلط ہے۔ نہیں درحقیقت اُس کا کہنا صحیح اور اِس کا بولنا غلط ہوتا ہے۔ اور اہلِ زبان ہی اُس میں تمیز کر سکتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۵۴)

(۲۷۲) دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں لے لینا کبھی عبارت کا لطف بڑھانے کیلئے ہوتا ہے۔ کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور نئے لفظوں کو اُس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کیلئے بولا جاتا ہے کبھی اُس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے۔ جو عظمت اُسکے مرادف لفظ سے جو اُس زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں بیٹھتی مثلاً بعضے اہلِ زبان اپنی تحریر و تقریر میں مناسب موقع پر جسکی مناسبت کو اہلِ زبان ہی جان سکتے ہیں جنٹلمین کا لفظ بولتے ہیں۔ اگر وہ اُسکی جگہ شریف یا شریفوں کا لفظ بولیں۔ تو اُس لفظ یا مطلب کی عظمت خاک میں ملجاتی ہے۔ اسلئے کہ ہماری زبان اور عام استعمال میں لفظ شریف کا ذلیل ہو گیا ہے۔ اُس سے بجز اِس خیال کے کہ اُسکے حسب و نسب میں کچھ نقصان نہیں ہے شیخ۔ سید۔ مغل پٹھان ہے۔ اور کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اُس لفظ کے بولنے والا اُس خیال سے زیادہ تر وسیع اور اعلےٰ خیال دل میں بٹھانا چاہتا ہے۔ وہ اِس لفظ سے ایسا شخص بتانا چاہتا ہے۔ جو رذیل آدمیوں کی بہ نسبت خاندان میں تعلیم میں حیثیت میں اطوار میں افضل ہو۔ اُسکی تعلیم و تربیت۔ اُس کا چال چلن اچھا ہو۔ نیک اور خوش اخلاق ہو وہ ہر بات میں جو اُس سے متعلق ہو حلیم ہو۔ چال چلن میں حوصلہ اور مزاج میں خواہش اور ارادہ میں سلیم ہو۔ ایسا ہونا تعلیم سے شروع ہوتا ہے۔ اور پڑھے کو گنتا اور نیک صحبت میں بیٹھنا اُسکو پورا کرتا ہے اگرچہ شریف کے بھی یہی معنی ہونے چاہئیں۔ گرچہ کہ اُس کا استعمال ایک خاص بات پر ہو گیا ہے۔ تو یہ پورا پورا خیال اُس لفظ سے دل میں نہیں آتا پس ایک محب قوم اہلِ زبان اُن خیالوں کو دل میں ڈالنے کیلئے اپنی زبان

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو ضد حقیقی تہذیب و اخلاق کے ہیں۔ (ایضاً)

(۲۷۷) خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے۔ کہ اُس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں یا اُس انسانی جذبہ میں جس سے وہ متعلق ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں کہ فطرتی جذبات اور اُنکی قدرتی تحریک اور اُنکی اصلی حالت کا کس پیرایہ یا کنایہ اشارہ یا تشبیہ و استعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔ (ایضاً)

(۲۷۸) ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے۔ کہ وہ اصل صورت یا اصلیت و حقیقت کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جسکی تعریف کرتے ہیں اُسکے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۳ صفحہ ۱۹۵)

(۲۷۹) کسی مصنف کے عیب و ہنر کی نسبت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کسی شخص کو اُسکے منشاء کا ٹھیک علم ہو سکتا ہے بجز اُنکے جنکو مصنف کے زمانہ کے قواعد انشاپردازی اور خیالات کے ڈھنگ سے یا اُن امور سے جو کسی نہ کسی طرح پر اُس مضمون سے جسمیں وہ کتاب تصنیف ہوتی ہے علاقہ رکھتے ہیں۔ پوری واقفیت اور کامل مہارت حاصل ہو۔ (خطبات احمدیہ)

(۲۸۰) جب ہم کسی خط کو پڑھتے ہیں۔ تو اُسمیں ایک بہت لمبا چوڑا القاب و آداب پاتے ہیں۔ اُن دونوں میں صرف شاعرانہ الفاظ ثناء و صفت مکتوب الیہ کے ہوتے ہیں۔ جو درحقیقت مکتوب الیہ میں نہیں ہیں حالانکہ القاب میں یا تو بیگانہ وار (اگر مکتوب الیہ بیگانہ ہے) کوئی ایسا لفظ ہونا چاہئے۔ جو خطاب کا مشعر اور مخاطب کرنے کیلئے کافی ہو یا اُس دلی تعلق اور ادب کو ظاہر کرتا ہو۔ جو درحقیقت کاتب کو مکتوب الیہ سے ہے۔

آداب معلوم نہیں کیا لغو چیز ہے۔ ایشیا کے امراء اور بادشاہ ہمیشہ اس خیال میں تھے کہ جو ہم سے کمتر ہیں وہ بمنزلہ ہمارے غلاموں کے ہیں۔ اور بدبختی سے وہ لوگ بھی اپنے تئیں ایسا ہی سمجھتے تھے۔ اور ہر قسم اور ہر موقع کی ملاقاتوں اور بات چیت میں وہ لوگ اُس خیال کو کبھی بھولتے نہ تھے۔ اس سبب سے آپس کی تحریروں میں بھی وہ رسم جاری ہوئی۔ جو خط و کتابت کیلئے زیبا نہیں ہے۔ فضول و بےمعنی وقت ضائع ہونے کے سوا آداب کے لفظوں کی رعایت سے دلی مطالب علی الخصوص اُس زور یا جوش سے جو دل میں ہے ادا نہیں ہو سکتے۔ قوم کے دل میں جو ایک غلامانہ انفعال پڑا ہوا ہے وہ دور نہیں ہو سکتا۔ (مجموعہ مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۱۴۲)

جو مصیبت اور رنج اور غم والدین پر پیش آتا ہے۔ ایسا امر ہے۔ کہ اخلاق اور انسانیت کے برخلاف ہے اور یہ بات نہایت مشتبہ ہے۔ کہ انکی اولاد مثل ہماری قوم کے ہمدرد ہو گی۔ اور اُن سے قومی ترقی ہو گی۔

(۲۷۴) رسم نیوتہ۔ اِس کو بالکل بند کرنا چاہیئے۔ اگرچہ لوگ اِس میں بہت فائدے بیان کرتے ہیں لیکن آپ خیال کیجئے۔ کہ جس کو آپ نیوتہ دیتے ہیں۔ اُسکو اِس کے سبب سے ضرور بہت سے اخراجات کا متکفل ہونا لازمی ہو جاتا ہے پس اِس رسم سے دونوں کا نقصان ہے۔ اے میرے دوستو! اِن تمام رسموں کو چھوڑو۔ اور جو کچھ بچا سکو۔ قوم کیلئے بچاؤ اور قوم کی حالت پر رحم کرو۔ اے دوستو اِس بیس برس کے عرصہ میں خود میرے ہاں اور میرے بہت سے عزیزوں اور قریب رشتہ داروں کے ہاں ہر قسم کی شادیاں پیش آئیں جنمیں ضرور تھا۔ کہ میں بھی اُن بچوں اور بچیوں کو جنکی شادیاں ہوئیں متعدد موقعوں پر کچھ دیتا۔ مگر میں نے کسی کو ایک حبہ دیا نہ کسی سے لیا اور میں نے یقین کیا۔ کہ بہتر یہی ہے۔ کہ ان سب رسموں کو چھوڑوں۔ اور اپنی قوم کو پکڑوں۔ اور اپنے دوستوں سے بھی ایسا ہی کرنیکی آرزو رکھتا ہوں۔ (مجموعہ لکچرز صفحہ ۴۴۹)

ادبی

(۲۷۵) علم ادب و انشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے۔ اور ہموزن اور قریب التلفظ کلموں کے تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہانتک کہ دوستانہ خطوط کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوتی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہو گا جسمیں جھوٹ اور وہ بات جو حقیقت میں دل میں نہیں ہے مندرج نہو خطوط رسمیہ کے پڑھنے سے ہرگز تمیز نہیں ہو سکتی۔ کہ حقیقت میں اِس خط کا لکھنے والا ایسا ہی ہمارا دوست ہے۔ جیسا کہ اسمیں لکھا ہے۔ یا صرف معمولی مضمون ہے جس کے لکھنے کا عموماً رواج پڑ گیا ہے۔ پس ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے۔ اور ہم کو جھوٹی اور بناوٹی تحریر کا عادی کر دیا ہے۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۳ صفحہ ۸۴)

(۲۷۶) فن شاعری جیسا ہمارے زمانہ میں خراب اور ناقص ہے۔ اُس سے زیادہ کوئی چیز بُری نہو گی مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ اُن بدجذبات

ہے۔ وہ کہاں تک اِس میں اثر کر جاتی ہیں۔ اور دوسری طبیعت سے ہو جاتی ہیں حقیقت میں انسان کی طاقت سے بھی بہت زیادہ اور بلند درجہ پر ہے۔ چنانچہ مختلف قوموں کی مختلف رسموں پر لحاظ کرنے سے اِس بات کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔ (ایضاً۔

(صفحہ ۹۰)

(۲۷۱) جو لوگ رسموں کی پابندی کے طرفدار ہیں۔ اُن سے یہ سوال ہوتا ہے۔ کہ جن رسموں کی تم پابندی چاہتے ہو۔ وہ رسمیں بھی بعد اصلاح و ترمیم و تبدیل کے تمہارے بزرگوں نے قائم کی تھیں۔ کیونکہ تمہارے بزرگوں کے بزرگ اِس سے بھی زیادہ وحشیانہ رسموں میں مبتلا تھے۔ پس جبکہ ہمارے بزرگوں نے اپنے بزرگوں کی رسموں کو اصلاح کیا ہے۔ تو ہم اپنے بزرگوں کی رسموں کو جو اصلاح کے قابل ہوں۔ کیوں نہ اِصلاح کریں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۹۲)

(۲۷۲) رسومات کی اصلاح و ترقی جس طرح کہ انسان کے ظاہری طریقۂ زندگی کو فائدہ دیتی ہے۔ اسی طرح اُس کی عقل کو بھی ترقی دیتی ہے۔ ایک بات کے پیچھے لگے رہنے اور اُسی لکیر پر چلنے سے انسان کی عقل سو جاتی ہے اور قوتِ ایجاد جو خدا نے انسان میں رکھی ہے۔ وہ معطل بلکہ قریب معدوم ہونے کے ہو جاتی ہے۔ اور اِس سبب سے قومی تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قوتِ ایجاد کے معطل ہونے سے تمام علوم و فنون میں فتور آ جاتا ہے اور کسی چیز میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ جولاہے۔ اور بڑھئی اور لوہار بھی اپنے اپنے پیشہ میں نہ کچھ ترقی کر سکتے ہیں اور نہ کچھ ایجاد کرتے ہیں۔ اور ٹھیک ٹھیک یہی حال ہندوستان کا رسومات کی پابندی سے ہو گیا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۹۳)

(۲۷۳) اگر یہ طریقہ جاری رہے۔ کہ لڑکے ولایت جاویں۔ اور اپنا وقت اور زمانہ جوڑوں کے ڈھونڈھنے میں صرف کریں۔ تو کس قدر ترقئ تعلیم میں ہرج پڑتا ہے اور جو قلیل زمانہ ولایت کی تعلیم کا ہے۔ اُس کا بڑا حصہ جوروکے پیچھے صرف ہوتا ہے۔ جس وقت ہم خیال کرتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں برادری کی شادی سے تعلیم غارت ہو جاتی ہے۔ چہ جائیکہ ولایت میں۔ اور پھر اُن کے واپس آنے پر

کی بنا پر جاری ہوئی مستند ہو جاتی ہے۔ پرانے مذہب کے لوگوں میں بہت مذہبی رسمیں انسان کی یاد سے پہلے جاری ہیں۔ وہ نہیں جانتے۔ کہ وہ کیوں جاری ہوئی تھیں۔ اور اُن سے کیا فائدہ ہے۔ اور اب ہم کیوں اِن کو کرتے ہیں۔ پس وہ تمام باتیں بجز اِسکے کہ رسم و رواج میں داخل ہوں۔ اور کسی میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ (ایضاً صفحہ ۸۴)

(۲۶۷) میری رائے ہے۔ کہ مذہب بھی رسم و رواج پیدا ہونیکا ایک سبب ہوتا ہے مگر جب تک کہ اُسکے مسائل بطور رسم کے جاری نہ ہو جاویں۔ رسم و رواج سے زیادہ قوت نہیں رکھتا۔ اکثر قوموں میں بلکہ دنیا کی کُل قوموں میں بہت سی ایسی رسمیں پائی جاویں گی۔ جو درحقیقت اُنکے مذہب کے برخلاف ہیں۔ مگر اُن رسموں نے اُنکے دلوں میں ایسی مضبوط جڑھ پکڑی ہے۔ کہ مذہب کی نہایت زبردست اور طاقتور کَل بھی اُسکے اُکھاڑنے سے عاجز ہو گئی ہے۔ (ایضاً)

(۲۶۸) رسم و رواج کی حکومت انسانوں کے دلوں میں نہایت قوی اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ ہر شخص غلام سے زیادہ اُسکی تابعداری کرتا ہے۔ آقا کو اپنے غلام پر کبھی کبھی نافرمانی کرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر رسم و رواج کو اپنے غلاموں کی نسبت نافرمانی کا کبھی اندیشہ نہیں ہوا۔ (ایضاً صفحہ ۸۵)

(۲۶۹) تعجب یہ ہے۔ کہ جاہل اور عالم۔ نادان اور عقلمند سب برابر اِسکی غلامی کرتے ہیں۔ اچھا۔ قابل اور لائق آدمی جو فلاسفی اور حکمت کے باریک باریک مسئلے حل کرتا ہے۔ جب اِن باتوں تک پہنچتا ہے۔ جن کا رسم و رواج مدت سے چلا آتا ہے۔ تو تمام اپنی قابلیت اور عقل و تمیز کو بھول جاتا ہے۔ اور محض نادان شخص کی مانند اُس کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ (ایضاً)

(۲۷۰) یہ خیال کہ ہماری رسموں میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے (گو وہ کیسے ہی مضبوط یقین سے دل میں بیٹھا ہوا) بھروسے اور اعتماد کے لائق نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے۔ کہ صرف عادت نے یہ خیال ہمارے دل میں جمایا ہو۔ اِس بات کا اندازہ کرنا کہ انسان جن عادتوں میں ابتداء سے پرورش پاتا ہے اور پلتا ہے اور بڑھتا

باہمی معاشرت کے معاہدہ سے مستحکم کرتا ہے۔ غرضیکہ اسی حالت کا نام شائستگی ہے اور اِن سب کے سبب سے طبیعت کی تمام قوتیں ظاہر اور شگفتہ ہو جاتی ہیں۔ اور اِسی کی بدولت علم کے خزانے کھل جاتے ہیں۔ اور پھر اُن کا ایک دریائے فیض دور دور تک بہنے لگتا ہے۔ اور پھر معقول اور پند آمیز گفتگو اور انسانیت کی اور بہت سی باتوں کی تحقیق اور تکمیل سے انسان کو شہری ہونے کا رتبہ حاصل ہوتا ہے جو وحشیوں کے درجہ سے بہ مراتبہا بلند ہے۔ (ایضاً صفحہ ۶۹)

(۲۶۴) رسم اُس کا نام ہے۔ جو ہمارے بزرگوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ گو کہ ہم کو یہ بھی معلوم نہ رہا ہو۔ کہ وہ کیوں تھا۔ اور اُس سے کیا فائدہ ہے۔

رواج اُس کا نام ہے جس کو سب لوگ کرتے ہوں۔ یا کرنے لگیں۔ اور اُسکے کرنے کو لوگ کچھ عیب نہ سمجھیں۔ پس ہو سکتا ہے۔ کہ ایک زمانہ میں کوئی کام عیب گنا جاتا ہو۔ مگر جب وہ رواج پا جاوے۔ تو لوگوں کی آنکھ میں کچھ عیب نہ ہو۔ (ایضاً صفحہ ۸۲)

(۲۶۵) عادت اور رسم میں ایک نہایت باریک تفاوت ہے۔ عادت خود ہماری طبیعت کا ایک اصول ہے۔ جو خود ہم میں سے پیدا ہوا ہے۔ اور جو بالطبع اور بے تکلف ہم کو کسی کام کے بار بار کرنے کو کہتا ہے۔ رسم ایک اصول ہے۔ جو باہر سے ہم میں آیا ہے جس کے سبب سے ہم کسی کام کو بار بار کرتے ہیں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے۔ مثلاً دان پُن خیرات۔ زکوٰۃ دینے کی رسم سے فیاضی کی عادت پیدا ہوتی ہے اور پوجا کرنے اور نماز پڑھنے کی رسم سے مندروں میں گرجاؤں میں اور مسجدوں میں جانے کی عادت ہوتی ہے۔ (ایضاً)

(۲۶۶) کوئی مذہبی قانون یہاں تک کہ موسیٰ کے دس احکم بھی ایسے نہیں ہیں۔ جن کا رواج قبل اُن کے لکھے جانے کے نہ ہو چکا ہو۔ بانیٔ مذہب گو کہ وہ خدا ہی کی طرف سے آیا ہو۔ وعظ و نصیحت سے ایک بات کا رواج دینا چاہتا ہے یہاں تک رفتہ رفتہ اُس گروہ کے معتقدین میں رواج پا جاتی ہے۔ اور جبکہ اُس پہ ایک عرصہ گذر جاتا ہے۔ تو بمنزلہ قانون مذہبی کے یعنی ایسی رسم کے جو ایک مذہب

قوم میں مفلسی اور ناشائستگی بےحیائی اور بےغیرتی پھیلاتی ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۲۴)

(۲۶۱) اچھے چال چلن کے برخلاف بعض رسمیں ایسی ہیں۔ جو غرور یا نمود یا اعتقاد باطل پر مبنی ہونیکی وجہ سے ناجائز اور مُضر ہیں۔ ان رسموں کے گھٹانے اور مٹانے میں دولتمند اور ذی وقار ہندوستانی شریف بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ایسی بُری رسموں کو جو ازروئے اخلاق کے ناجائز اور عام فائدہ و فلاح کے مخالف ہوویں ہرگز گوارا کرنا مناسب نہیں۔ گو وہ کسی اعتقاد کے بموجب جائز گردانی گئی ہوں۔ یا کسی مذہب کے روسے قائم کی گئی ہوں۔ (مجموعہ لکچرز۔ صفحہ ۳۰)

(۲۶۲) دختر کشی کی رسم ایک ایسی بد اور خراب رسم ہے۔ کہ انسان کے دل میں جو اچھے اخلاق کا اثر قبول کرنیکی قابلیت ہے۔ وہ رسم صرف اُسی کو مغلوب نہیں کرتی اور زنا اور بداخلاقی ہی پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ مخلوق کی بھی مانع ہے۔ جس کے سبب سے قوم کی شان و شوکت اور دولت نہیں بڑھ سکتی۔ (ایضاً)

(۲۶۳) آدمی کا شائستہ ہونا صرف اُن عادات کے ترک کرنے پر موقوف ہے جو خونخوار وحشیوں کے خواص سے ہیں۔ اور جو خاص ایسے زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ جس میں کسی طرح تہذیب و تربیت نہ ہو۔ اور وہ اس قسم کی صفات ہیں۔ جیسے کہ جنگجوئی۔ شکار بازی۔ غارتگری۔ جابجا نقل مکان کرنا۔ بلا امتیاز مباشرت کرنا اور مثل ان کے ایسی حرکتیں کرنا۔ جو کسی قانون یا ضابطہ کے بموجب نہ ہوں حالانکہ یہ سب عادات ایسی ہیں۔ جب کوئی وحشی بھی اُن کے فائدوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ جو ان کے ترک کرنے میں متصور ہیں تو وہ بھی نہایت خوشی کیساتھ ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً بجائے ان کے امن و امان اور زراعت اور جان و مال کا حفظ اور سکونت کے مکانوں یا شہروں یا دیہات میں قرار پانا اور نکاح کے احکام و قوانین مستقلہ کا ہدایت کیواسطے مقرر ہونا اور ذاتی اختیارات کا انسان پر حاصل ہونا سب ایسے امور ہیں۔ کہ ان کے فائدوں سے آگاہ ہونے کے بعد خودبخود انسان اُن کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور جو حقوق انسان کو قدرتی حاصل ہیں۔ اُن کو

مذاق اور تہذیب و خیالات کے اُن کو آراستہ کرتی ہیں۔ مگر یہ خیال کہ ڈاڑھی منڈانا تہذیب میں داخل ہے۔ ایک محض غلط خیال ہے۔

پس ڈاڑھی جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ بشرطیکہ وحشیانہ پن سے نہ رکھی جاوے۔ تہذیب کے برخلاف نہیں ہے۔ چنانچہ ہزاروں۔ لاکھوں۔ کروڑوں اشخاص جو نہایت مہذب قوم کے ہیں ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ملک کے بھی خوبصورت گورے رنگ کے چہروں پر بشرطیکہ گورا رنگ ہو۔ کالی ڈاڑھی نہایت خوبصورت اور بھلی معلوم ہوتی ہے۔ (ہاں جب سفید ہو جاوے۔ تو منڈانے کے قابل ہو جاتی ہے بشرطیکہ مُنہ کی جھرّیاں اور گالوں کے گڑھے اور مُنہ کا پوپلا پن صورت کو بدنما کردے) اِس کے سوا مُنہ کی رونق اور شجاعت و بہادری و رعب اُس سے پایا جاتا ہے۔ پس اس کا رکھنا یا منڈانا ہماری بحث سے خارج ہے۔ اور ہم اُس پر بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ہم قطعاً اُن مسائل سے جن کو مانع تہذیب نہیں سمجھتے بحث نہیں کرتے۔ اگر ڈاڑھی منڈانا ناجائز ہو۔ تو اُس سے ہمارا کچھ ہرج نہیں۔ اگر جائز ہو تو ہمارا کچھ ہرج نہیں لیکن اگر ڈاڑھی کو ایک ٹٹی بنایا جاوے جیسی اوجھل شکار کھیلا جاوے تو اُس سے منڈانا ہی بہتر ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۶۲)

(۲۶۰) بلاشبہ لنگی ہونا اور روزینہ دار ہونا انسان کے لئے بڑی آفت ہے اِس زمانہ میں مُلکی معافی دار اور روزینہ دار سب سے زیادہ خراب و بُری حالت میں ہیں۔ مگر میری دانست میں ایک اور فرقہ بھی ایسا ہی ہے یعنی وہ لوگ۔ جو پیر بن کر شہر بشہر اپنے مریدوں سے ٹکس وصول کرتے پھرتے ہیں۔ یا منبر پر بیٹھ کر جھوٹے سچے قصے سُنا کر اور واعظ بن کر لوگوں سے روپیہ لیتے پھرتے ہیں۔ اور بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں کسی پیر فقیر کے خاندان کا بیان کر کر کسی درگاہ کا خادم کہکر یا مکہ معظمہ کا مطوّف اور مدینہ منورہ کا زیارت کرنے والا بتا کر روپیہ مانگتے پھرتے ہیں۔ جو مسلمان کہ اِن لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ درحقیقت اپنی قوم کے نیچی مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ نامہذب خیرات نہایت بُری چیز ہے۔ اُس سے

ایسی چیز ہے۔ کہ اِس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اِس کا تعلق ہے۔ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اِس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے۔ تو وحشیوں میں شہریوں میں سب میں اُس کا نشان ملے گا۔ گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں الّا سب کی جڑھ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے۔ کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی چیز کو ناپسند۔ یا یوں کہو۔ کہ کسی چیز کو اچھا ٹھیراتا ہے۔ اور کسی چیز کو بُرا اور اُسکی طبیعت اِس طرف مائل ہے۔ کہ اُس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے۔ جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑھ ہے۔ جو انسانوں کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اِس تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں۔ کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو حدِ اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا۔ اور اُنکو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدرِ امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا اور اُن سب کو خوش سلوبی سے برتنا۔ اور اُس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے۔ جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۳)

(۲۵۹) بال جو انسان کے سر پر اور مُنہ پر خدا نے پیدا کئے ہیں۔ اگر انسان اُن کو ایک پریشانی اور ابتری کی حالت میں رہنے دے۔ جیسے کہ بعض میلے کچیلے بے تمیز جنگلی جانوروں کے ہوتے ہیں۔ تو بلا شبہ وہ پورا وحشیانہ پن ہے۔ اگر اُن کو درستی اور خوبی سے رکھے۔ تو وہ تہذیب و شائستگی کی علامت ہے۔ اِسی لئے تمام مہذب قومیں بقدر اپنی تہذیب اور موافق اپنے خیالات کے بال بناتی ہیں اور موافق اپنے

سے کام لیں۔ اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر چلیں یعنی جو عمدہ و مفید ہیں اُن کو اختیار کریں جو قابلِ اصلاح ہوں اُنمیں ترمیم کریں۔ اور جو بُری اور خراب ہوں اُنکی پابندی چھوڑ دیں۔ نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اُسی سے لپٹے رہیں۔

(ایضاً)

(۲۵۵) رسومات جو مقرر ہوتی ہیں۔ غالباً اُس زمانہ میں جبکہ وہ مقرر ہوئیں۔ مفید تصور کی گئی ہوں مگر اِس بات پر بھروسہ کرنا۔ کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ جن لوگوں نے اُنکو مقرر کیا۔ اُنکی رائے میں غلطی ہو۔ اُن کا تجربہ صحیح نہ ہو۔ یا اُنکا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو۔ یا اُس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو۔ یا وہ رسم اُس وقت اور اُس زمانہ میں مفید ہو۔ الاحال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو۔ یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو غرضیکہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی نقصان نہ ہو۔ تو یہ نقصان ضرور ہے۔ کہ آدمی کی عقل اور دانش اور جودتِ طبع اور قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔

(ایضاً صفحہ ۲۸)

(۲۵۶) رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کے مانع و مزاحم ہے چنانچہ وہ پابندی ایسی قوتِ طبعی کے جسکے ذریعہ سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے۔ برابر مخالف رہتی ہے۔ اور انسان کی تنزل حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔

(ایضاً)

(۲۵۷) طریقِ زندگی ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے۔ کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریقِ زندگی ہمارے طریقۂ زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

(ایضاً صفحہ ۵۳)

(۲۵۸) سولزیشن کیا چیز ہے؟ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے۔ یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اِسکو پیدا کیا ہے۔ اِسکے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ

ہیں۔ تو کافی ثبوت نادانی اور ضمانت کا ہوتی ہیں۔ (ایضاً)

(۲۵۱) جب ہم چاہتے ہیں۔ کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچاویں۔ تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں۔ وہ ہم کو بنظر حقارت نہ دیکھیں۔ تو ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بنظر تحقیق دیکھیں۔ اور جو بری ہوں۔ انکو چھوڑیں۔ اور جو قابل اصلاح ہوں۔ انمیں اصلاح کریں۔ (ایضاً صفحہ ۱)

(۲۵۲) جو رسومات کہ بسبب حالت ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ رسمیں ٹھیک ٹھیک اُس قوم کی ترقی اور تنزل یا عزت اور ذلت کی نشانی ہوتی ہیں۔

اِس مقام پر رسم لفظ ترقی یا تنزل کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور تمام قسم کے حالات ترقی و تنزل مراد لئے ہیں۔ خواہ وہ ترقی و تنزل اخلاق سے متعلق ہو خواہ علوم و فنون یا طریق معاشرت و تمدن سے۔ اور خواہ ملک و دولت و جاہ و حشمت سے (ایضاً)

(۲۵۳) بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں۔ آدمی کی اُن صفتوں کی ترقی و شگفتگی نہیں ہوتی۔ جو خدائے تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ اُن قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے۔ جبکہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے۔ وہ شخص اُس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اُسی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ وہ استعمال میں لائی جائیں اُن قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے شخص کیلئے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے۔ اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۶)

(۲۵۴) جو امر پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل

رہیں۔ (ایضاً)

(۲۴۷) کچھ شبہ نہیں۔ کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروج ہیں۔ اُن کا رواج یا تو ملک کی آب وہوا کی خاصیت سے ہوا ہے۔ یا اُن اتفاقیہ امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورتِ تمدن ومعاشرت کے پیش آ گئی ہے۔ یا دوسری قوم کی تقلید واختلاط سے مروج ہو گئی ہیں۔ یا انسان کی حالتِ ترقی یا تنزل نے اسکو پیدا کر دیا ہے۔ پس ظاہر ایہی چار سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں رسوم وعادات کے مروج ہونے کا مبداء ومنشاء معلوم ہوتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۹)

(۲۴۸) جو رسوم وعادات کہ بمقتضائے آب وہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں اُنکے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے انکو سکھلائی ہیں۔ جس کے صحیح ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ مگر صرف اُن کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے۔ (ایضاً)

(۲۴۹) طریق تمدن ومعاشرت روز بروز انسانوں میں ترقی پاتا جاتا ہے۔ اور اسلئے ضرور ہے۔ کہ ہماری رسمیں وعادتیں جو بضرورت تمدن ومعاشرت مروج ہوتی تھیں انہیں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے۔ اور اگر ہم اُن پہلی ہی رسموں وعادتوں کے پابند رہیں۔ اور کچھ ترقی نہ کریں۔ تو بلا شبہ بمقابل اُن قوموں کے جنہوں نے ترقی کی ہے۔ ہم ذلیل وخوار ہونگے۔ اور مثل جانوروں کے خیال کئے جاویں گے پھر خواہ اِس نام سے ہم بُرا مانیں یا نہ مانیں۔ انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور نا تربیت یافتہ قوموں کو ذلیل وحقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں۔ تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شائستہ وتربیت یافتہ ہیں۔ اگر وہ بھی ہم کو اُسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں۔ تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے؟ ہاں اگر ہم کو غیرت ہے تو ہم کو اُس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہیئے۔ (ایضاً)

(۲۵۰) دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے۔ مگر جب وہ رسمیں اندھے پنے سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی

اور مشقت کے حاصلات کے چھین لینے کا اُس کو قابو ملتا ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ ربا (سود) اخلاق و معاشرت و تمدن کے برخلاف ہے۔ (تفسیر القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۱۴)

(۲۴۴) سویلیزیشن انگریزی لفظ ہے۔ جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اُس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اُس سے مراد ہے۔ انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت۔ تمدن اور طریقہ تمدن اور صرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا۔ اور اُن کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے۔ اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۵)

(۲۴۵) بھلائی اور برائی فی نفسہ مستقل چیز ہے۔ رسم و رواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے۔ کہ کوئی اُسکے کرنے پر نام نہیں دھرتا عیب نہیں لگاتا۔ کیونکہ سب کے سب اُس کو کرتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہ بُری ہے۔ تو اچھی نہیں ہو جاتی۔ پس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کی رسومات کے اچھے ہونے پر بھروسہ کر لینا نہ چاہئے بلکہ نہایت آزادی اور نیک دلی سے اُنکی اصلیت کا امتحان کرنا چاہئیے تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات ہو۔ جو حقیقت میں بد ہو اور بہ سبب رسم و رواج کے ہم کو اُس کی بدی خیال میں نہ آتی ہو۔ تو معلوم ہو جاوے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔ (ایضاً صفحہ ۸)

(۲۴۶) سب سے مقدم اور ضروری امر اس کام کیلئے یہ ہے۔ کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور اُن تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سننے اور کرنے سے روکتے ہیں۔ خالی کریں۔ اور اُس نیکی سے جو خدا تعالےٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے ہر ایک بات کی بھلائی یا برائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں۔ یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور دوسری قوم اور دوسرے ملک دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہئے تاکہ جو رسم و عادت ہم میں بھلی ہے۔ اُس پر مستحکم رہیں۔ اور جو ہم میں بُری ہے۔ اُسکے چھوڑنے پر کوشش کریں۔ اور جو اُن میں بُری ہے۔ اُس کے اختیار کرنے سے بچتے

نیک و دیندار آدمی بھی اپنی گفتگو میں تہذیب و شائستگی کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ دوست کی بات کو جھوٹ کہدینا۔ دوست کی نسبت جھوٹ کی نسبت کر دینا۔ یہ تو اونٰے اور روزمرہ کی بات ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵)

(۲۴۰) نیکی پر متوجہ ہوتے ہیں۔ تو اُس کو اتنا گھونٹتے ہیں کہ بدمزہ ہوجاتی ہے اور جب بدی پر اُترتے ہیں پھر تو شیطان کے بھی کان کترتے ہیں۔ (ایضاً)

(۲۴۱) یہ بات یاد رکھنی چاہئے۔ کہ جب تک کسی کام کیلئے کوئی قاعدہ اور طریقہ مقرر نہیں ہوتا۔ اور بخوبی اُس کی پابندی نہیں کی جاتی۔ اُس وقت تک وہ چلتا نہیں۔ اور جب قاعدہ عمدہ ہوتا ہے۔ تو رفتہ رفتہ از خود اُس کا رواج ہوجاتا ہے۔ اور سب لوگ اُس کو کرنے لگتے ہیں۔ اور چند عرصہ بعد اُسی کی ایسی عادت ہوجاتی ہے۔ کہ طبیعت ثانی بنی جاتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۴)

(۲۴۲) تمام جذبات انسانی کو جن میں سے پُرانی رسم کی پابندی سب سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔ اور انسان کو ٹھیک بات تک پہنچنے نہیں دیتے۔ ذرا دل کو ٹھنڈا ٹھنڈا کر کر تجویز کیا جائے۔ کہ درحقیقت کونسی بات دین و دنیا کے لئے مفید ہے۔ جو ہم کو کرنی چاہئے۔ (ایضاً صفحہ ۵۲)

(۲۴۳) ربا درحقیقت ایک نہایت بُری چیز ہے۔ اور انسانی اخلاق اور تمدن کیلئے بعضی حالتوں میں نہایت مضر ہے۔ ربا جبکہ ایک پیشہ کرلیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سود خور، آڑہتی اور مہاجن بطور پیشہ کے اسکو برتتے ہیں۔ تو تمدن کیلئے نہایت مضر ہوتا ہے۔ ذی مقدور شخص اُس روپیہ کو ملک کی ترقی اور تجارت کی افزونی میں صرف نہیں کرتا بلکہ خود اپنے ملک کے لوگوں سے اُن کا مال لے لینے میں صرف کرتا ہے۔ وہ اپنی محنت اور مشقت سے معشیت پیدا کرنے میں بالکل سست ہوجاتا ہے۔ اور لوگوں نے جو محنت اور مشقت سے کمایا ہے۔ اُسکے لے لینے پر راغب ہوتا ہے اُسکے مال و دولت سے کوئی صنعت یا کوئی ایسا کارخانہ جس سے لوگوں کو معشیت میں مدد پہنچے اور ملک کی دولت کو ترقی ہو۔ نہیں قائم ہوتا۔ بجز اِسکے کہ غریبوں سے اُنکی محنت

پیدا ہوتا ہے۔ یا اعزاز و تقدس پیدا ہونے کی جسکی لوگ۔ قدر کرتے ہیں۔ یا صرف دوستوں کو
فائدہ پہنچانے کی۔ بغیر کسی ذاتی غرض کے۔ (ایضاً)

(۲۳۶) نہایت مشکل یہ ہے۔ کہ دنیا میں کسی قوم کی سوسائٹی اور سوشل حالت ایسی نہیں ہے۔ کہ جس میں ایسے امور بھی شامل نہ ہوں جن کی بنا غلط یا صحیح طور پر مذہبی امور پر مبنی ہونی نہ کہی جاتی ہو۔ پس اگر وہ امور ترقی سوسائٹی کے مانع ہیں۔ اور غلطی سے اُن کی بنا مذہبی امور پر کہی جاتی ہے۔ تو جب تک اُس قوم کا کوئی شخص اُس غلطی کو ظاہر نہ کرے۔ اور اُس مانع کے رفع کرنے میں کوشش نہ کرے۔ تو وہ رفع نہیں ہوسکتی۔ (ایضاً صفحہ ۱۳۹)

(۲۳۷) کثرت یا تعداد ازدواج پر یا طلاق کے جائز ہونے پر جو لوگ عقلی یا اخلاقی یا تمدنی لحاظ سے اعتراض کرتے ہیں۔ اُن سے بہت زیادہ اعتراض اِس پر ہوتے ہیں۔ جب ایک زوجہ کے سواء دوسری زوجہ کرنے کا امتناع ہو اور بجز زنا کے اور کسی حالت میں طلاق دینا جائز نہ ہو۔ پس اُس پر مخالف یا موافق کا قلم فرسائی کرنا محض بے سود ہے۔ بلکہ عقلاً اور انصافاً عمدہ طریقہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک پہلو پر اور جو نقصان عقلی اور تمدنی اُن دونوں صورتوں میں واقع ہوتے ہیں۔ اُن پر غور کرکے ایک درجہ توسط اختیار کیا جائے۔ تاکہ جہاں تک ممکن ہو۔ اُن دونوں صورتوں میں جو عقلی اور اخلاقی اور تمدنی نقصان ہیں۔ اُن میں کمی واقع ہو۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۴۳)

(۲۳۸) علم مجلس اور اخلاق اور برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریقہ پر پڑ گیا ہے۔ جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔ اخلاق صرف منہ پر میٹھی میٹھی باتیں بنانے اور اوپری تپاک جتانے کا نام ہے۔ آپس میں دو شخص ایسی محبت اور دلسوزی کی باتیں کرتے ہیں۔ کہ دیکھنے سننے والے اُن دونوں کو ایک مغز و دو پوست سمجھتے ہیں۔ مگر جب اُنکے دل کو دیکھو۔ تو ایک پوست و دو مغز سے زیادہ بے میل ہیں۔ صرف مکاری اور ظاہر داری کا نام اخلاق رہ گیا ہے۔ اور بے ایمانی۔ دغا بازی کا نام ہشیاری۔ (تہذیب الاخلاق جلد ۳ صفحہ ۱۲)

(۲۳۹) گفتگو پر خیال کرو۔ تو عجب ہی لطف دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ اکثر لفظ تو نہیں ہوتے۔ مگر ہزاروں اکثر مضمون زبان سے نکلتے ہیں۔ نہایت مہذب اور معقول و ثقہ

جھوٹی عزت دینے اور جھوٹی دوستی جتانے کو موجود ہو جاتے ہیں۔ اور جب تک وہ ہے یہ بھی حاضر ہیں۔ اور جب وہ نہیں۔ تو پھر یہ بھی حاضر نہیں۔

عزت خود ایک صفت ہے۔ جو مثل اور صفتوں کے خود انسان کی ذات ہوتی ہے۔ سب سے پہلے خود انسان اپنے آپکو معزز سمجھتا ہے۔ اِس عزت کی بدولت اُس کا دل نہایت قوی اور خوش رہتا ہے۔ وہ مطلق اِس بات کی خواہش نہیں رکھتا۔ کہ کوئی دوسرا اُسکی عزت کرے۔ بلکہ اُس کی خوشی اِسی میں ہوتی ہے۔ کہ وہ خود ایسا ہو۔ کہ آپ اپنی عزت پر یقین کرے۔ جب انسان ایسا ہو جاتا ہے۔ تو تمام دنیا از خود اُسکی عزت کرتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا۔ کہ لوگ میری عزت کریں۔ مگر بے اختیار دوست دشمن، اُس کے آگے جھکتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۷)

تمدنی و معاشرتی

(۲۳۳) ایک کلیہ قاعدہ ہے۔ جو ہر ایک زمانہ اور ہر ایک قوم سے یکساں تعلق رکھتا ہے اور کوئی چیز کسی زمانہ میں اِس سے مستثنےٰ نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ قاعدہ یہ ہے۔ کہ جس چیز کی قدر ہوتی ہے۔ اُس کی بہتات ہوتی ہے۔ (سر سید کے آخری مضامین صفحہ ۵)

(۲۳۴) یاد رہے۔ کہ جو چیز دنیا میں لکار آمد اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ اُسکی قدر کبھی نہیں گھٹتی۔ جب تک کہ اُس سے زیادہ مفید دوسری چیز پیدا یا ایجاد نہ ہو جائے۔ اور جو چیزیں بطور شغلہ کے ہوتی ہیں۔ تو جب شغلہ رکھنے والے نہیں رہتے۔ یا وہ ذریعہ باقی نہیں رہتا۔ جو اِس شغلہ کو قائم رکھے۔ تو اُن چیزوں کی قدر گھٹ جاتی ہے۔ (ایضاً)

(۲۳۵) یہ بھی کلیہ قاعدہ ہے۔ کہ دنیا میں جو کچھ کیا جاتا ہے۔ کسی نہ کسی غرض سے کیا جاتا ہے۔ اور وہ غرض کبھی تو اُس کام کا معاوضہ حاصل کرنے کی ہوتی ہے اور کبھی کسی امر میں کمال حاصل کرنے کی جس کے باعث خود اُس کے دل میں ایک قسم کا فخر

کے نزدیک بد ہو۔ مگر کانشنس انسانوں کو مختلف بلکہ متضاد و بالکل نقیض باتوں کیطرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور وہ دونوں سچی ہدائتیں نہیں ہو سکتیں۔

کانشنس فی نفسہ کوئی چیز نہیں۔ اور نہ وہ ابتداً کسی مذہب کا اصل اصول قرار پانے کے لائق ہے۔ اور نہ وہ فی حد ذاتہ رہنما ہونے کے مستحق ہے۔ ہاں بلاشبہ جبکہ سچے اصول پر انسانی طبیعت تربیت پا جاوے۔ یا سچے خیالات سے اُس کی طبیعت موثر ہو جاوے۔ اور طبیعت اُس سچائی کے مطابق حالت پیدا کرلے تب وہ حالت طبیعت یعنی کانشنس انسان کا محافظ اور انسان کا رہنما ہوتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۸)

(۲۳۰) بلاشبہ مہذب آدمیوں کی بُرائیاں اُنکی بہت سی خوبیوں اور کمالوں کے سبب چھپ جاتی ہیں۔ اور لوگ اُن پر بہت کم خیال کرتے ہیں۔ تاہم وہ بُرائیاں کچھ ہنر نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ جو بُرائی ہے۔ وہ برائی ہی رہتی ہے۔ گو کہ ایک مہذب قوم میں ہی کیوں نہ ہو۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۴)

(۲۳۱) عام اور خاص اور ظاہری اور باطنی اطوار اور طریقوں میں کچھ اور ترقی ہونیکی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ایک متوسط درجہ کا ہندوستانی بھی خوش اخلاقی اور تواضع و تکریم اور اچھی تربیت کی باتوں میں ایسے اور ملکوں کے اعلیٰ درجہ کی آدمی سے جن پر خدا نے زیادہ عنایت کی ہے۔ اور وہاں کے باشندوں کو بہت سی تربیت اور تعلیم بخشی ہے زیادہ رتبہ رکھتا ہے۔ حاصل یہ کہ ہماری یہ خواہش نہیں ہے۔ کہ ہمارا چال چلن ذرا بھی بدل جاوے۔ بلکہ بڑی آرزو یہ ہے۔ کہ وہ بدستور قائم رہے۔ (مجموعہ لکچرز صفحہ ۲۹)

(۲۳۲) میری زبان سے دو لفظ دولت و عزت نکلے ہیں۔ اکثر لوگ دولت کو ہی عزت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا ایک بڑی غلطی ہے۔ دولت بلاشبہ اِس بات کا ذریعہ ہے۔ کہ چند خوشامدی کمینہ خصلت والے۔ خوشامد کیلئے اور جھوٹی تعریف کرنے اور

اُن کو نیک جتاتی ہے۔ پھر تو وہ لوگ اپنی بدیوں پر خیال ہی نہیں کرتے۔ یا اُن بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داؤد نے نہایت دلچسپ لفظوں میں اِس بزدلی سے پناہ مانگی ہے اور اِس طرح پر خدا کی مناجات کی ہے۔

"کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے تو ہی"
"مجکو میرے پوشیدہ عیبوں سے پاک کر"

جو لوگ علانیہ بدی کرتے ہیں۔ اگر اُن کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے کیلئے نصیحت کی ضرورت ہے۔ تو وہ لوگ جو درحقیقت موت کی راہ چلتے ہیں۔ اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے رستہ پر سمجھتے ہیں کس قدر رحم کے لائق ہیں۔ اور کتنی نصیحت کے محتاج ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۹۴)

(۲۲۹) کانشنس ۱؎ - یہ مسئلہ وہ ہے۔ جس پر اِس زمانہ کے آزادمنش اور انسان کو مختار اپنے افعال کا ماننے والے اپنے مذہب یا مشرب کا اصل اصول قرار دیتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ مسئلہ ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ کیا کانشنس کوئی ایک جدا قوت ہے۔ جو انسان میں جدا گانہ اُس کی ہدایت کیلئے خدا نے پیدا کی ہے؟ حالانکہ اِس کا کچھ ثبوت نہیں۔ اور اگر فرض بھی کرلیں۔ تو اُس سے کوئی نتیجہ سچی ہدایت اور اصلی رہنمائی کا نہیں۔ کانشنس نہایت عمدہ چیز ہے۔ اور انسان کو بُرائی سے بچانے اور بھلائی کی طرف راغب کرنیکو بہت اچھا رہنما ہے۔ مگر درحقیقت وہ ایک حالت انسان کی طبیعت کی ہے۔ اور اُسکی تربیت کا ایک نتیجہ ہے۔ پس فی نفسہ وہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ تربیت سے یا خیالات سے جو کیفیت انسان کی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے۔ اُس کا یہ نام ہے۔

اگر فی الواقع وہ ایک قوت رہنمائی کیلئے بمنزلہ ایک پیغمبر کے انسان میں ہو۔ تو ضرور ہے۔ کہ وہ تمام انسانوں کے لئے یکساں رہنما ہو یعنی جس بات کو ایک انسان نیک سمجھے۔ اُس کو تمام انسان نیک سمجھیں۔ اور جس بات کو ایک بد جانے وہ سب انسانوں

۱؎ کانشنس یعنی وہ قوت ممیزہ جو خدا نے ہر ایک انسان کے دل میں پیدا کی ہے۔ اور جو نیک اور بدکاموں میں تمیز کرتی ہے۔ انسان کے لئے سچی ہادی اور پیغمبر ہے۔

اگر ہم مرے ہوئے لوگوں کی آواز پر کان دھریں۔ اور سمجھیں۔ کہ وہ قبروں میں پڑے ہوئے زبان حال سے کیا کہہ رہے ہیں۔ تو شاید ایک بھی بُرائی دنیا میں نہ رہے۔ مگر افسوس کہ ہماری آنکھیں اندھی اور ہمارے کان بھرے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۵۵)

(۲۲۶) انسان اعتقادیات پر کتنا ہی زیادہ خیال کرے۔ اُسکے اخلاق میں کچھ تفاوت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اخلاق پر کیسا ہی متوجہ ہو۔ اُس کے اعتقادیات میں کچھ نقصان نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ دونوں کام دو جدا جدا آلوں اور دو جدا جدا شخصوں سے متعلق ہیں۔ پہلا ہمارے دل یا ہماری روح اور خدا سے۔ دوسرا ہماری ظاہری حرکات اور جذبات اور انسان سے۔ (ایضاً صفحہ ۹۰)

(۲۲۷) میں یہ کہتا ہوں۔ کہ کوئی اعتقاد یا کوئی مذہب سچا ہو ہی نہیں سکتا جس کا نتیجہ اخلاق کی عمدگی نہ ہو۔ پس اخلاق کو کسی مذہب کا کچھ سہارا درکار نہیں ہے۔ بلکہ مذہب یا اعتقاد کے سچ سمجھنے کو اخلاق کا سہارا درکار ہے۔ (ایضاً صفحہ ۹۱)

(۲۲۸) دنیا میں ایسے لوگ بھی بہت ہیں۔ جن کا ظاہر کچھ۔ باطن کچھ ہوتا ہے دنیادار اور رند مشرب آدمی جس قدر کہ در اصل وہ بد ہیں۔ اُس سے زیادہ اپنے تئیں بد بتلاتے ہیں۔ دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں۔ اُس سے زیادہ نیک اپنے آپکو جتلاتے ہیں۔ وہ تو دینداری کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے ہیں۔ اور دن رات عشق و تماشبینی اور رنگ رلیوں کی باتوں کی جن کو در اصل اُنہوں نے کیا بھی نہیں گپیں اُڑاتے ہیں۔ اور یہ حضرت بیشمار گناہوں اور بدیوں کو ایک ظاہر دینداری کے پردہ میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں بُرے نہیں ہیں۔ مگر ایک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں۔ جو اِن دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں۔ اور اُنہیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اُنکی بناوٹ ایک اور ہی عجب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب نہیں دیتے۔ بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکہ میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود اُن سے انہیں کے دل کے حال کو چھپاتی ہے۔ جس قدر کہ درحقیقت وہ نیک ہیں۔ اُس سے زیادہ

نیازمندی کا اظہار کیا۔ کچھ اُن کی جھوٹی تعریف کی۔ آؤ بھگت کی۔ اور دل میں کہا۔ کہ خوب اُلو بنایا۔ جب وہ چلا گیا۔ تو یا تو بُرا کہنے لگے۔ یا جو باتیں کی تھیں۔ اُنکا نقش بر آب کا سا بھی نشان نہ تھا۔ (ایضاً)

(۲۲۱) صدق مقال وہ صفت ہے۔ جو انسان کو قطب و ابدال کے درجہ سے بھی بڑھا دیتی ہے۔ مگر یہاں ہمارا مطلب دُنیاوی باتوں میں سچے پن کا ہے۔ ضرور ہے۔ کہ سب لوگ سچ میں غیرت سمجھیں۔ ایک شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھے۔ تاکہ قائل کو قبل کلام اس بات کی غیرت ہو۔ کہ سامع میرے اِس قول کو جھوٹ نہ سمجھے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں۔ کہ کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ آپس میں ایک دوست دوسرے کو کہتا ہے کہ میاں کیوں جھوٹ بکتے ہو۔ اِن باتوں سے جھوٹ کے عیب اور جھوٹ کے طعنے کی غیرت دل سے جاتی رہتی ہے۔ جو بڑا سبب ذلت قومی اور نامہذب اور ناشائستہ ہونے قوم کا ہوتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۳)

(۲۲۲) ہماری راہ و رسم جو دوستوں سے ہے۔ اُس میں بھی نہایت نقص ہیں ہم آپس میں اِس طرح پر نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں۔ بلکہ اِس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ اُن کا تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنی ایک بڑا ضروری امر ہے۔ (ایضاً)

(۲۲۳) طرز گفتگو اور سیاق کلام بھی جزو اعظم تہذیب و شائستگی کا ہے جسکی ہم میں بہت کسر ہے۔ ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں ہوتے ہیں۔ نہایت کم مستعمل ہیں۔ اور اِسلئے اُس کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔ (ایضاً)

(۲۲۴) لہجہ۔ اِس کو بھی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ اکثر لہجہ یا اِس قسم کی آواز جس سے شبہ ہو۔ کہ آدمی لڑتے ہیں۔ یا جانور لڑتے ہیں ناشائستہ ہونیکی نشانی ہے۔ کسی قدر اِس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔ (ایضاً)

(۲۲۵) اگر ہم اِس بات پر خیال کریں۔ کہ انسانوں کے عیوب مثل کالے بادلوں کے جمع ہو کر ہم ہی پر برستے ہیں۔ تو دنیا سے انسانوں کے عیوب بہت ہی کم ہو جاویں۔ اور

دقیقہ کا سو حصہ دیتا ہے۔ (ایضاً)

(۲۱۷) رحم اور موانست اور ہمدردی شاید نتیجہ میں متحد ہوں۔ مگر ہر ایک کا منشا مختلف ہے۔ رحم ایک فطرتی نیکی ہے۔ جو ہمجنس اور غیر جنس دونوں کیساتھ برتی جاتی ہے موانست کا اثر صرف ہمجنسوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ ہمدردی جو عقل کے نتیجوں میں سے ہے۔ ذی عقل ہی میں ہو سکتی ہے۔ اور اسلئے صرف انسان ہی میں منحصر ہے۔ پس جس میں ہمدردی نہیں اُس کی انسانیت میں نقصان ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۳)

(۲۱۸) قریبوں سے ہمدردی نہ کرنی نہایت بدخصلت قابل سزا کے ہے۔ اسلئے کہ قدرت کے نہایت مستحکم قاعدے کو توڑتا ہے۔ اور کرنی کچھ بڑی صفت نہیں۔ کیونکہ قدرت نے اُس کے کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ بعیدوں سے ویسی نہ کرنی کچھ سخت مذمت نہیں۔ اسلئے کہ قدرت کے کسی مستحکم قاعدہ کی برخلافی نہیں۔ اور کرنی نہایت عمدہ صفت ہے۔ کیونکہ قدرت کے منشاء کو بدرجۂ اتم کامل کرتا ہے۔

ہر ایک قسم کی نیکی کو جب خیال کروگے۔ تو وہ اُسی شخص کی ذات پر منحصر ہوگی۔ اور اُسی کی فنا کے ساتھ ہی منقطع ہوگی۔ اسلئے زہد و تقوےٰ۔ عبادت و سخاوت۔ خیر دائم نہیں ہو سکتی۔

اگر غور سے دیکھا جاوے۔ اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جاوے۔ تو بجز رفاہِ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔ انسان کی بھلائی نہ نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اُس زمانہ کے انسانوں کے فنا ہونے سے فنا ہوتی ہے بلکہ نسل در نسل اور پشت در پشت آیندہ انسانوں میں چلی آتی ہے۔ اور قیام دنیا تک قائم رہتی ہے۔ اور اسلئے صرف وہی ایک نیکی ہے۔ جس کو خیر دائم کہہ سکتے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۴)

(۲۱۹) غیرت اور عزت یہ دونوں آپس میں ایسی ملی ہوئی ہیں۔ کہ کبھی جدا نہیں ہوتیں جس کو عزت ہے اُسکو غیرت ہے۔ جسکو غیرت ہے اُس کو عزت ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۲)

(۲۲۰) بالفعل مدار اخلاق ہم لوگوں میں اِس پر رہ گیا ہے۔ کہ جس کسی سے ملے کچھ ہنسکر سلام کیا۔ کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں۔ دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنائیں۔ کچھ اپنی جھوٹی

نہیں دیتا۔ اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے۔ بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے۔ تو اُسکے فائدے اور اُسکی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اُس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۱۲)

(۲۱۳) متعصب اُن تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم وفنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اسکی عقل اور اُسکے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ اُس میں سمائی ہوئی ہے۔ اُسکے سواء اور کسی بات کے سمجھنے کی اُس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے۔ کہ اُس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے۔ اُسکے سواء اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔ (ایضاً)

(۲۱۴) بہت سی قومیں ہیں۔ جو اپنے تعصب کے باعث تمام باتوں میں کیا اخلاق اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجۂ ذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں۔ اور بہت سی قومیں ہیں جنہوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنےٰ درجہ سے ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئیں (ایضاً۔ صفحہ ۱۳)

(۲۱۵) تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دُنیاوی باتوں میں۔ نہایت بُرا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ مغرور و متکبر ہو جاتا اور ہمجنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ بجز کوڑے پر کی گھاس چرنیکے اور کچھ نہیں جانتا۔ کہ باغ کیوں بنا ہے؟ اور پھول کیوں کھلا ہے؟ نرگس کیا دیکھتی ہے؟ اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے؟۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۴)

(۲۱۶) غیر متعصب گو اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اُسکی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے۔ اُس کے اصول کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے۔ مخالفوں اور معترضوں اور بُرا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سُنتا ہے اور خود بھی اُس کے دفعیہ پر مستعد ہوتا ہے۔ اور اور لوگوں کو بھی اُس کے

ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں۔ یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ! تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اُڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں سانس جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ ناک بھوں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستینیں چڑھا۔ ہاتھ پھیلا۔ اسکی گردن اُس کے ہاتھ میں۔ اُسکی ڈاڑھی اسکی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا۔ تو غراتے ہوئے ایک اُدھر چلا گیا اور ایک اِدھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا۔ تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑے۔ سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے۔ اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں توں تکار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر اِن سب میں کسی نہ کسی قدر کُتّوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے۔ کہ اپنے دوستوں سے کُتّوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۰۸)

(۲۱۱) غصہ ایک ایسی چیز ہے۔ کہ معاملات کی اصلیت کو آنکھ سے چھپا دیتا ہے طبیعت انتقام اور سیاست کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ (حیات جاوید۔ ضمیمہ نمبر ۴۔ صفحہ ۵۴)

(۲۱۲) انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے۔ کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اُس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے۔ مگر اُس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسان سے ہے۔ اُس میں نہیں ہے متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے۔ تو اپنے تعصب کے سبب اُس غلطی سے نکل نہیں سکتا۔ کیونکہ اُس کا تعصب اُسکے برخلاف بات کے سُننے اور سمجھنے اور اُس پر غور کرنیکی اجازت

وہ زبان۔ جو وہ کہے۔ جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔ ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ۔ جو وہ لکھے۔ جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۰۰)

(۲۰۷) میں رشتے و ناتے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔

(۲۰۸) دنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہے۔ ہر ایک اپنا کام کرتا ہے۔ تم اپنا کام کرو مگر جان لو۔ کہ تمہارا کیا کام ہے نیکی بھلائی۔ اور اپنے کام سے مطلب۔ دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں۔ جس سے دل رُکا ہو۔ اُس سے مت ملو۔ کیونکہ اُس سے ملکر خوشی نہ ہوگی۔ یا منافقانہ طریقہ پر ظاہرداری کرنی پڑیگی۔ نہ ملنے میں بہ نسبت ملنے کے آرام ہے۔ اِسی طرح اُن کی باتوں کی پرواہ نہ کرنے میں بالکل آرام ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۱۵)

(۲۰۹) تعصب برخلاف شریعت ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اِس میں گرفتار ہیں خدا کی نامہربانی اُن کی طرف رجوع ہے۔ پھر اِس کا علاج کیا ہے؟ خدا کے ساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۳۴)

(۲۱۰) جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں۔ تو پہلے تیوری چڑھاکر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چیر کر کانوں سے جالگتی ہیں۔ اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتی ہے۔ اور عنیف آواز کیساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اُس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اُس کی ٹانگ اُسکی کمر میں۔ اُس کا کان اُس کے منہ میں اور اُس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں۔ اُس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اُس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا۔ جو کمزور رہا۔ دُم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کرکے آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی

(۲۰۳) حضرت نہایت تعجب کی بات ہے۔ کہ آپ باوجود مقتدائے دین ہونے کے صرف طعن و ملامت کے خوف سے جس بات کو دل سے حق جانتے ہیں۔ اُسکے موافق کبھی عمل نہیں کرتے ہ۔ اور دُنیا کے مکروہات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر جو بات حق معلوم ہوتی ہے اُس کے کرنے میں ایک لحمہ توقف نہیں کرتے اور لوگوں کے طعن و ملامت سے نہیں ڈرتے۔ (ایضاً صفحہ ۴۷۶)

(۲۰۴) کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو۔ کہ میں بُرا کروں۔ اور اُس کو اسلئے چھپاؤں۔ کہ لوگ بُرا نہ کہیں ہ ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے۔ جسکے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے۔ جو بات کہتے ہیں۔ وہ سنتا ہے جو دل میں لاتے ہیں۔ جان لیتا ہے۔ ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے۔ نہ زمین پر چھوڑے۔ نہ رات کو الگ ہو۔ نہ دن کو الگ ہو۔ نہ غیر فریح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی۔ تو پھر تم سے کیا ڈرتا۔ (ایضاً صفحہ ۴۸۶)

(۲۰۵) میں تو اُس شخص کو کافر بے ایمان سمجھتا ہوں۔ جو دوست کی نسبت خیال کرے کہ اُس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی یا کہی ہوگی۔ میں تو دوست کے گالی دینے اور بُرا کہنے کو بھی دوستی پر حمل کرتا ہوں۔ اور درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے۔ مگر جبکہ حقیقت میں خلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو۔ تو پھر شیشۂ محبت جو نہایت نازک ہے۔ کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دوستی اور محبت ایسی سخت چیز ہے۔ کہ ہتھوڑوں اور ہزاروں صدموں سے نہیں ٹوٹتی مگر وہ نازک بھی ایسی ہے۔ کہ باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اُس سے نسبت نہیں۔ ایک ادنےٰ اسی خلاف محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اور جس قدر محبت زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اُسکی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۹۶)

(۲۰۶) جو ملال اُن کی طرف سے میرے دل میں ہوا ہے۔ وہ ابتک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جاوے وہ آنکھ۔ جو کسی کو دیکھے اُس نگاہ سے۔ جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔ گل جاوے

میں ریفارمر کہلاتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۵)

(۱۹۹) ہر ملک میں کچھ تفریح کا بھی سامان ہونا چاہئے۔ وہ لوگ جو اپنے دماغ کی قوت مفید اور عمدہ کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ کسی وقت تفریح بھی حاصل کریں تھیٹر میں ایک لازمی امر یہ ہے۔ کہ نصیحت آمیز باتوں اور بد اخلاقی کے عیوب دکھانے کے ساتھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ جو بد اخلاقی اور بدنفسی کی باتوں کو بھی یاد دلاتی ہیں یا سکھاتی ہیں۔ پس تھیٹر ایسے ملک میں ہونا چاہئے۔ کہ جہاں تعلیم نے اور سوسائٹی نے لوگوں کے دل پر ایسا اثر کر دیا ہو۔ کہ اُن کے دل پہلی قسم کی باتوں سے موثر اور دوسری قسم کی باتوں سے نو معمول کرنیکے قابل ہوں۔ (سفرنامہ پنجاب صفحہ ۱۷)

(۲۰۰) نہایت کمینہ آدمی وہ ہے۔ جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو۔ اور اُس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے۔ جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اُس کے کرنے میں تامل کرے۔ (حیات جاوید حصہ ۲ صفحہ ۳۸۵)

(۲۰۱) کیا آپ کو یقین دلی ہے۔ کہ وہ خط درحقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ایسا یقین نہیں ہے۔ تو کیا یہ کانشنس کے برخلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہیں سمجھتے اُس کو بطور سچ کے ظاہر کرو۔ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو۔ آپ کا دل اُس کو سچ جانتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتا اور اُس کو سچ کے طور پر بیان کیا۔ تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمانداری کے کام کیا۔ آپ مجھ کو معاف کیجئے گا۔ بسبب اِسکے کہ آپ سے محبت ہے۔ یہ کڑوی نصیحت کی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۷۴)

(۲۰۲) میں اِس خیال سے کہ آپ میری کسی تحریر کا بُرا نہ مانیں گے جو میرے دل میں آتا ہے۔ لکھ بھیجتا ہوں۔ خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے۔ کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجہ پر ہوں۔ اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے۔ جسکے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں۔ اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے۔ ایسی ہی پرائیویٹ خطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے۔ (ایضاً)

ملکی و تمدنی امور کی الف و موانست سے اور بچپن سے کسی امر کی ممارست و تربیت و صحبت کے اثر سے موثر ہو جاتی ہے۔ اور اِس قوت کی ایسی حالت کو تمام اہل مذاہب کانشنس یعنی نور ایمان و نور دھرم سے تعبیر کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ قابل اعتماد اور لائق طمانیت کے نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کا دوست و غیر دوست دونوں قسم کے اثروں سے موثر ہونا اور مخالف اثروں سے ایک ہی نتیجہ حاصل ہونا ممکن ہے۔ (تفسیر القرآن جلد ۱ صفحہ ۱۲)

(۱۹۶) ایک اور قوت بھی انسان میں پائی جاتی ہے۔ جو اُن تمام اثروں پر غالب ہو جاتی ہے۔ اور جس کو میں نور قلب یا نور فطرت کہتا ہوں۔

ہمارے پاس بہت سے لوگوں کی نسبت تاریخی شہادت موجود ہے۔ جنہوں نے بچپن سے ایک خاص قوم کی رسم و عادات میں تربیت پائی اور اُنہی ملکی و تمدنی باتوں کے سوا اور کوئی خیال اُن کے دل میں نہیں گذرا۔ اور زمانۂ دراز تک اُس قومی و ملکی و تمدنی امور کی الف و موانست میں رہے اور ایک ہی سی صحبت پائی۔ اور ایک ہی سی تربیت ہوئی۔ اور پھر خود اُنہوں نے اپنی سوچ سمجھ اور غور و فکر سے جسے الہام کہنا چاہئیے۔ اُن تمام بندشوں کو توڑا۔ اور اُن کے عیبوں کو جانا اور اپنے تئیں اُس سے آزاد کیا۔ اور لوگوں کے آزاد کرنے میں کوشش کی۔ (ایضاً)

(۱۹۷) یہ قوت فکری کم و بیش انسانوں میں فطرتی ہے۔ اور ہر شخص خود اپنے حال پر فکر کر کر سمجھ سکتا ہے۔ کہ وہ اُس کے کام میں لانے پر قادر ہے۔ اور یہی وہ قوت ہے جو حق و باطل میں تمیز کرتی ہے اور اصلی سچ کو پرکھ لیتی۔ اور انسان کو اپنی حالت کی اصلاح پر متوجہ کرتی ہے اور تمام بوجھوں کو جو انسان پر بہ سبب اُس کے ملکی و تمدنی و آبائی رسم و رواج کی الف و موانست سے ہوتے ہیں۔ اُنکو اُٹھا دیتی ہے۔ یہی قوت ہے۔ جس کے باعث انسان مکلف ہوا ہے۔ اور دیگر حیوانات سے افضل کہا گیا ہے (ایضاً صفحہ ۱۴)

(۱۹۸) کبھی وہ قوت فطری ایسی قوی ہوتی ہے کہ خود بخود اُس میں سے روشنی نکلتی ہے اور حق و باطل میں فرق دکھاتی ہے۔ اور ملکی و تمدنی و آبائی رسم و رواج کی الف و موانست کے بوجھ کو اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شرع کی زبان میں پیغمبر اور تمدنی اصلاح

اُس میں کوئی اچھی بات ہو تو اُس کو چن لوں۔ اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو۔ تو اسکو صحیح کرلوں اور جب ایسی بات اُس میں کوئی نہیں پاتا۔ تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے۔ اور اُن غلطیوں کو اِس طرح پر بتاتا ہے۔ جیسے ایک دلسوز دوست بتاتا ہے۔ کہیں کہیں طبیعت کو تروتازہ کرنے کے لئے نہایت دلچسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے۔ اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اُٹھتا ہے۔ اور باوجود مخالفت کے ایکدوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ (ایضاً)

(۱۹۱) انسان کو چاہئے۔ کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راستبازی نیکی اور نیکدلی کو کام میں لاوے۔ کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔ ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے۔ (ایضاً)

(۱۹۲) دل کی جس قدر بیماریاں ہیں۔ اُن میں سب سے مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کرلیتا ہے۔ تو اُسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے اسیطرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اُس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۹۵)

(۱۹۳) اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے۔ کہ خوشامد کا شوق کیسے نالایق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے۔ تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالایق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ (ایضاً)

(۱۹۴) ہمارا عقیدہ ہے۔ کہ وہ لوگ جو سچے پاک باز اور تقوے شعار ہیں۔ گو وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں۔ ویسے ہی تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔ جیسے کہ خود اپنے ہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ۔ (خطبات احمدیہ)*

(۱۹۵) ہم انسانوں میں ایک اور چیز بھی پاتے ہیں۔ جو نیک و بد میں تمیز کرسکتی ہے یا ایک بات کو دوسری بات پر ترجیح دے سکتی ہے۔ یہ قوت بھی کبھی بلکہ اکثر قوجی

* مطبوعہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ پریس۔

چاہئے۔ کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں۔ اُس میں سے ہم کس قدر کے مستحق ہیں۔ اور پھر یہ سوچنا چاہئے۔ کہ جن کاموں کے سبب سے وہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ کام ہم عمدہ غرض سے اور نیک نیتی سے دنیا کو فائدہ پہنچانے کیلئے کرتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہئے۔ کہ وہ نیکیاں جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں۔ ورحقیقت ہم میں کہاں تک ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۸۱)

(۱۸۷) حد سے زیادہ سرگرمی اور تعصب اور کسی خاص فرقہ یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو بُرا اور حقیر سمجھنا یہ ایسی باتیں۔ جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ فی نفسہ نہایت بُری ہیں۔ گو کہ وہ ہم سے کمزور دل آدمیوں کو اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

اِس پر بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو دینداری اور نیکی کے لئے نہایت مشہور ہیں۔ مگر نہایت لغو اور نرے شیطانی اصولوں کو نیکی سمجھکر اپنے دل میں اُس کی جڑھ گاڑ دی ہے۔

میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں۔ کہ میں نے آجتک کوئی ایسا عقلمند اور انصاف پسند شخص نہیں دیکھا جس میں پوری پوری یہ سب باتیں ہوں۔ اور پھر بھی وہ گناہ سے پاک ہو۔ (ایضاً)

(۱۸۸) دشمنی۔ عداوت اور رنجش اور ناراضی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو خود اُس شخص میں کمینہ عادتیں اور رذیل اخلاق پیدا کرتا ہے اور بعوض اِس کے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہنچاوے۔ خود اپنا آپ نقصان کرتا ہے۔ اِس انسانی جذبہ کو ہم مخالفت کہتے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۹۴)

(۱۸۹) حسد کا منشاء صرف وہ اوصاف حمیدہ ہوتے ہیں۔ جو محسود میں ہیں اور حاسد اُن کا خواہاں ہے۔ مگر وہ اِس میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ (ایضاً)

(۱۹۰) دنیا میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے۔ کہ تمام لوگ ایک رائے پر گو وہ کیسی ہی اچھی ہو متفق ہو جاویں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیکدلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے۔ کہ اگر

سب ایک عاقل ماں کے بچے ہو توڑ دیا اور جس طرح ایمان کیلئے کلمہ توحید پہلا رکن ایمان کا ہے اُسی طرح **وحدت** پہلا رکن بورڈنگ ہوس کی فایدہ مندی کے لئے ہے اور جس طرح ایمان کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی ایمان کے لایق نہیں رہتا۔ اسی طرح بورڈنگ ہوس کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی بورڈنگ ہوس کے قابل نہیں رہتا۔ اسلئے تم کو لازم ہے کہ مثل ماں جائے بھائی کے آپس میں محبت اور دوستی برتو۔

بورڈنگ ہوس ایک کَل ہے قوم کو قوم بنائیگی۔ اگر اُسکے پُرزے درستی سے چلتے ہیں تو وہ اپنا کام کرے گی ورنہ کسی کام کی نہیں۔ تم اُس کَل کے پُرزے ہو اور اسلئے اُس سے فایدہ اُٹھانے کے لئے ہو۔ تمہارا درست اور کام کے قابل رہنا سب سے مقدم ہے۔

تمہارا کھانا۔ پینا۔ رہنا سہنا۔ آپس میں ہر وقت ملنا۔ سوسئیٹی میں شریک رہنا کھیلوں کو آپس میں ملکر کھیلنا۔ لٹریری جلسوں میں شریک رہنا۔ یہ سب باتیں اسلئے ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی ایک دوسرے کی ہمدردی پیدا ہو جو بنیاد قوم کے قوم بننے کی ہے۔ پھر اگر تم نے اِس میں قصور کیا تو تمام قوم کا مظلمہ تمہارے سر ہوگا اور تم پر افسوس ہوگا کہ جس عمارت کی تم خود ایک اینٹ ہو اُسی عمارت کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔

(مجموعہ لکچرز صفحہ ۱۵۴)

اخلاق

(تہذیب الاخلاق جلد [illegible] صفحہ ۱۲۲)

(۱۸۴) ضد اور نفسانیت انسان کے بہت بڑے دشمن ہیں۔ کسی اچھی بات کو ضد سے نہ ماننا اور اُس کے نیک و بد پر غور نہ کرنا درحقیقت انسان کا کام نہیں ہے۔

(۱۸۵) تجویز اور عمل اِن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تجویز ہمیشہ ہم کو پوری اور کامل کرنی چاہئے اور اُس تجویز پر عمل اُس قدر جتنا کہ ہم وقتاً فوقتاً کر سکتے ہیں۔ ایضاً صفحہ ۵

(۱۸۶) اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں۔ کہ ہم کیا ہیں۔ تو ہم کو اِس بات پر غور کرنی

لگے رہنے سے غافل نہیں ہوئے تم اُن کو نہیں دیکھتے تھے اور وہ تمہارے ساتھ رہتے تھے اور کبھی اپنی صورت اِس طرح سے تم کو دکھاتے تھے کہ تم اُن کو اپنا دوست سمجھتے تھے حالانکہ وہ تمہارے دشمن تھے۔

یہ زمانہ بھی تمہاری زندگی کا گذر گیا مگر اِس درمیان میں تم اپنے دشمنوں سے واقف ہو گئے اور اُن سے پناہ میں رہنے کے لئے تم نے ایک نہایت زبردست اور عاقل ماں تلاش کی اور اپنے آپکو اُس کی حفاظت میں سپرد کیا اور ایک نئی زندگی میں داخل ہوئے اور سمجھے کہ تمہاری وہ عاقل ماں ہے۔ کون؟ یہ کالج ہے جس میں تم داخل ہو اور اب تم سب اُس کے بچے ہو۔

تم سمجھے کہ وہ تمہاری نئی زندگی کیا ہے۔ وہ کالج لائف ہے۔ اگر تم نے اُس کو اچھی طرح گذارا تو تمہارا بیڑا پار ہے۔ ورنہ منجدھار میں ڈوبنا ہے۔ جس کے بعد پھر اُبھرنا اور ترنا نہیں۔ اب تم کو اختیار ہے۔ کہ چاہو اپنا بیڑا پار لگاؤ چاہو منجدھار میں ڈبوؤ۔

اے عزیزو! کالج لائف کا اطلاق اُن طالب علموں پر صادق نہیں آتا جو ڈے اسکالر ہیں بلکہ اُن پر صادق آتا ہے جو دن رات اپنی عاقل ماں کے ساتھ یعنی کالج کے احاطہ میں رہتے ہیں اور بورڈر کہلاتے ہیں پس میرے مخاطب وہی عزیز طالب علم ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اِس عاقل ماں کی گود میں ڈالا ہے۔ اور اِس کالج کے احاطہ میں رہتے ہیں۔

اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لیف سے کیونکر فائدہ اُٹھانا اور اُس کو کیونکر گذرانا چاہیئے۔

سب سے اول اور تمام برکتوں کی جڑ جو تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے تمام طالب علم ہندوستان کے ہوں یا پنجاب کے۔ پورب کے ہوں یا پچھم کے اُتر کے ہوں یا دکھن کے جب وہ سب تمہاری اُس عاقل ماں کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے اُن کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اُس پہلے اصول کو کہ تم

اِس کالج میں ایک جگہ جمع ہوتا ہے۔ پس تم کو سمجھنا ہے کہ اُس کتاب کو کیونکر پڑھو اور اُسکے معنے کیونکر سمجھو۔

اے عزیزو اِس کتاب کا نام ہے " **کالج لائف یا نئی زندگی** " یہی اصلی کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا اور اِس کالج کا ہے۔ اِس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور اعذار نہ کیا تو تمہاری آیندہ زندگی وہ زندگی ہوگی جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہئیے ورنہ اُسکی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔

تم اپنی زندگی کے پچھلے زمانوں پر غور کرو اور سمجھو کہ ہر ایک زمانہ تمہاری زندگی میں ایک نئی زندگی کا زمانہ گذرا ہے۔ جب تم بچے تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ تمہاری مائیں اپنی مادرانہ محبت سے پرورش کرتی تھیں۔ اگر وہ نہ کرتیں تو تمہارا زندہ رہنا محال تھا۔ چند سال بعد تمہاری زندگی میں ایک دوسرا زمانہ آیا جبکہ تم خود چلنے پھرنے اور اپنے آپ کھانے پینے لگے۔ یہ زندگی پہلی زندگی سے نئی زندگی تھی مگر تمہاری اِس زندگی میں اور اَور حیوانوں کی زندگی میں بہت کم فرق تھا۔ یہ زمانہ بھی تمہاری زندگی کا گذر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جس میں تم کو تعلیم کی اور مذہبی باتیں سکھانیکی اور اُن باتوں کی تعلیم کی ضرورت تھی جو تمہاری آیندہ زندگی کے لئے ضرور تھیں۔

یہ زمانہ بھی چند سال میں گذر گیا اور تم ایک اور نئی زندگی میں آئے جو خطرات سے خالی نہ تھی اِس زندگی میں تم ایسے آرام سے نہ تھے جیسے کہ پہلی زندگیوں میں تھے کیونکہ تم ہی میں بہت سے دشمن تمہارے پیدا ہو گئے تھے اور ہر وقت تمہاری گھات میں لگے ہوئے تھے۔ تمہاری آنکھوں پر اُنھوں نے ایک قسم کا پردہ ڈال دیا تھا کہ تم کو نیک و بد کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ تمہارے ماں باپ نے جہانتک اُن سے ہو سکا تم کو اُن دشمنوں سے بچایا۔ کوئی بچ گیا۔ کوئی کسی قدر بچا اور کسی قدر دشمنوں کے پنجہ میں پھنسا اور کوئی دشمنوں کے جال میں ایسا پھنسا جس کا اُس سے نکلنا نا ممکن ہوا۔

مگر جو بچے یا کسی قدر بچے دشمنوں نے اُن کا بھی ساتھ نہیں چھوڑا اور گھات میں

استحقاق کے جاگیریں حاصل ہوتی تھیں۔ یا کسی حیلے سے مدد معاش مِل جاتی تھی۔ یا بغیر لیاقت کے بڑے بڑے عہدے ملنے کی توقع تھی۔ یا زبردستوں کی محنت اپنے جاہ وحشم کیلئے چھین لی جاتی تھی۔ اب وہ زمانہ ہے کہ جب تک جوہر لیاقت اپنی ذات میں پیدا نہ کرے۔ دنیا میں فلاح کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۸۴)

اے عزیز طالب علموں!

(۱۸۳) مجھ کو اور تم کو اور تمہارے اُستادوں۔ تمہارے ماں باپ۔ تمہاری قوم کو اِس بات سے نہایت خوشی ہوگی۔ کہ تم دور دراز فاصلہ اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لئے جمع ہو۔ مختلف علوم کو پڑھتے ہو۔ اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات۔ عمدہ مسائل علمی۔ عمدہ مقولات اخلاق سے لطف اُٹھاتے ہو۔ تمہارے اُستاد گو کہ وہ تمہارے ملک اور تمہاری قوم کے نہیں ہیں۔ مگر تمہاری خوش قسمتی سے وہ تمہارے ساتھ پدرانہ محبت اور شفقت رکھتے ہیں اور ہر طرح تمہاری بہتری و ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں۔ مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اُس کو بنایا ہے۔ اُس کے حروف بہت پُرکار اور مجسم ہیں مگر اُن کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے اُسکے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر اُن کا سمجھنا کچھ آسان نہیں اُسکے پڑھنے کیلئے اُس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔

اُس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے۔ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا

اور آنسٹی پر مبنی ہے۔ مگر ہماری قوم میں یہ مقولہ مشہور اور اُس پر عمل درآمد بھی ہے۔ کہ "سل بٹے کی ہنڈیا چوراہے میں" مجھ کو کوئی نظیر ایسی معلوم نہیں ہے۔ کہ ہماری قوم کے دو چار آدمیوں نے بھی ملکر کوئی تجارت کا کام کیا ہو۔ اور اُس میں خیانت اور آپس میں بدگمانی اور آخر کو باہمی تنازع و تکرار نہ ہوئی ہو۔ اِن رذائل کا قوم سے دور کرنا اور فضائل کا اُن میں پیدا کرنا نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور تعلیم سے زیادہ تربیت پر منحصر ہے۔ نہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی جاننے سے۔ اور یونیورسٹی کی ڈگریاں حاصل کرنے سے۔ مدراس میں ہزاروں آدمی انگریزی جانتے ہیں۔ میں نے خود ایک مدراسی بی اے۔ کو دیکھا جو ایک انگریز کیساتھ تھا اور بیرا کا کام کرتا تھا۔ یہ اِس امر کا نتیجہ تھا۔ کہ تعلیم تھی۔ مگر تربیت نہ تھی۔ (ایضاً۔ ۴۶۱)

(۱۵۰) خدائے تعالےٰ نے اپنی مہربانی سے انسان کے دماغ میں ایسے قوےٰ عنایت کئے ہیں کہ وہ تعلیم و تربیت سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی کر سکتا ہے۔ اور جس شخص کو دماغی تربیت ہو جاوے وہ اُن کاموں کو بھی جو تجارت۔ حرفت۔ پیشہ سے متعلق ہیں۔ ایسی خوبی اور عمدگی سے کرتا ہے۔ کہ لوگ دیکھکر حیران رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے دُکاندار جو ادنیٰ حالت میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُس کا بڑا سبب یہی ہے کہ اُنکو دماغی تربیت نہیں ہوتی۔ اگر اُس پیشہ کیساتھ جو وہ کرتے ہیں دماغی اور اخلاقی تعلیم و تربیت بھی ہو تو جو پیشہ وہ کرتے ہیں۔ اُس میں بہت زیادہ ترقی۔ اور ہندوستان میں جو پیشہ وروں کی حقارت ہے۔ وہ بھی اُن سے دور ہو جاوے۔ (ایضاً۔ ۴۸۰)

(۱۵۱) تمہاری اولاد تمہارے پاس خدا کی امانت ہے۔ اور خدا نے تم کو اُن کا امانتدار اور ولی اور مربی بنایا ہے۔ پس جو جوہر کہ خدا نے تمہاری اولاد میں رکھے ہیں۔ اگر تم اُنکو تعلیم و تربیت سے جلا دیکر روشن نہ کرو گے۔ تو خدا کی امانت کے جوابدہ ہو گے اور اُن معصوم بچوں کی آیندہ زندگی کو خراب و برباد کرنے والے ہو گے۔ (ایضاً)

(۱۵۲) اے دوستو! اب وہ زمانہ نہیں ہے جس میں ایک خیالی اور فرضی اور غیر واقعی مضمون کو چھوٹے چھوٹے لفظوں میں نظم کرنے سے بہت بڑا صلہ مل جاتا تھا۔ بغیر

(۱۷۷) اوّل - یہ کہ جب تک اعلیٰ قوموں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں ہوتی۔ ادنےٰ قوموں اور غریب لوگوں میں ہرگز تعلیم نہیں پھیل سکتی۔

دوم - یہ کہ جب تک اعلیٰ درجہ کی تعلیم ملک میں موجود نہیں ہوتی۔ ادنےٰ درجہ کی تعلیم کا پھیلنا ناممکن ہے۔ دنیا کے کسی حصۂ ملک کی تاریخ سے ثابت ہوا ہے۔ کہ بدوں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے شائع ہوئے ادنیٰ درجہ کی تعلیم پھیلی ہو؟

قدرت کا قاعدہ ہے۔ کہ ادنےٰ اعلےٰ کی پیروی کرتا ہے کبھی اعلیٰ ادنیٰ کی پیروی نہیں کرتا۔ پس جو لوگ غریب لوگوں میں یا ادنےٰ درجہ کی تعلیم کے رواج کے خواہاں ہیں اُن کا سب سے اول یہ فرض ہے۔ کہ اپنی قوم میں اعلےٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کے پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ادنیٰ درجہ کی تعلیم غریب لوگوں میں رفتہ رفتہ از خود پھیل جاوے گی۔

ہر کوئی تسلیم کرتا ہے۔ اور میں بھی تسلیم کرتا ہوں۔ کہ قوم کا خوشحال ہونا اور تعلیم یافتہ اور معزز ہونا اِس بات پر منحصر ہے۔ کہ اُس میں معتدبہ تعداد کے لوگ نہایت اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہوں۔ اُسکے بعد نہایت کثرت سے تعداد ایسے لوگوں کی ہو۔ جو اوسط درجہ کی تعلیم پائے ہوں۔ اور اُس کے بعد ادنےٰ درجہ کے تعلیم یافتہ۔ مگر سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتوں کا موجود ہونا ہے۔ جو قوم کے افتخار کا باعث ہے۔ اور جو منبع اور مخرج باقی دو قسم کی تعلیموں کا ہے۔ جو لوگ اپنی کوششیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر متوجہ نہیں کرتے اور ادنےٰ درجہ پر مصروف کرتے ہیں۔ وہ اُلٹی گنگا بہاتے ہیں جس میں کبھی کامیابی نہ ہوگی۔

(ایضاً صفحہ ۲۸۱)

(۱۷۸) تعلیم کا معاملہ نہایت نازک ہے۔ اور اُس کے اثر اچھے یا بُرے جو نہایت آہستہ اور مخفی طور سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بہت کم نظر آتے ہیں۔ مگر وہ اثر نہائت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔

(ایضاً صفحہ ۲۹۰)

(۱۷۹) اِس زمانہ میں شخصی تجارت کا کام نہیں رہا ہے بلکہ متفقہ تجارت کی جس کو کمپنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گرم بازاری اور سرسبزی ہے۔ جس کی بنا اتفاق پر اور ایکدوسرے کی معاونت پر اور سب سے زیادہ راست معاملگی اور اُس سے بھی زیادہ دیانت

شامل نہ ہوں۔ اولاد میں انسانیت نہ آسکے گی۔ اے صاحبو! ہماری زندگی قریب الاختتام ہے۔ چند سال ہماری تمہاری عمر میں اللہ باقی ہیں۔ یہ سفید سفید ڈاڑھیاں۔ پوپلے پوپلے منہ زمین پر گڑھ کر یا مرگھٹ پر جل کر خاک ہو جائیں گے۔ مگر یاد رکھو۔ کہ یہ بچے جن کو تم نوجوان چھوڑ جاؤ گے۔ اُنکا یہ حال ہوگا۔ کہ روز بروز مفلس اور ذلیل و خوار ہونگے۔ جیل خانہ اُن سے بھرا کرینگے۔ اے ہندوؤ اور مسلمانوں! اگر مرنے کے بعد روح قائم رہتی ہے۔ تو مرنے کے بعد یہ حالت دیکھکر تمہاری پاک روحیں گھاٹوں اور قبروں پر تڑپیں گی۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۵)

(۷۴) بچوں کی تربیت کیلئے سچائی نیکی۔ لحاظ۔ سچی آزادی ہونی چاہئے۔ اور یہ تمام باتیں گھر پر تعلیم پانے سے نہیں آسکتیں۔ جب تک اُن کیلئے ایک ایسی تعلیم گاہ نہ ہو۔ اور وہ اُس تعلیم گاہ کے اڑ گڑے میں نہ ڈال دیئے جاویں جہاں بجز تعلیم اور تربیت کے اور کوئی چیز نہ ہو۔ (ایضاً صفحہ ۲۶۳)

(۷۵) یہ بات گورنمنٹ پر لازمی ہو گئی ہے کہ ہندوستانیوں کو اُس درجہ تک تعلیم دے۔ کہ انکو اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت ہو جائے۔ یا یوں کہو کہ وہ اپنے تئیں ایسا لائق کرنے کی کوشش کریں۔ کہ جو عہدے انگریزوں کو ملتے ہیں۔ وہ بھی پا سکیں۔ اگر گورنمنٹ ہندوستانیوں کو اُس درجہ تک کی تعلیم نہ دیگی۔ تو اُس نے اپنے اقرار کو پورا نہیں کیا۔ اور ہندوستانیوں کے حق میں ناانصافی ہوئی۔ کیونکہ وہ بے فائدہ ایسی کشاکش میں چھوڑ دیئے گئے۔ کہ جہاں تک اُن کو پہنچنا ہے۔ وہاں تک کا رستہ ہی نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۹۴)

(۷۶) گورنمنٹ اپنے فرض سے ہرگز بری نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ تعلیم کا کوئی ایسا طریقہ نہ قائم کرے۔ جس سے کہ ہندوستانی نوجوان بیس برس کی عمر میں اور بموجب قواعد حال کے اُنیس برس کی عمر میں اُس قدر قابلیت حاصل کرلیں۔ کہ وہ انگلستان میں جاکر سول سروس کے مقابلہ کا امتحان اپنے ہم پیشہ رعایا انگریزوں کے ساتھ دیں۔ (ایضاً)

تخم کو جس میں آیندہ نہایت عمدہ عمدہ پھل پھول پیدا ہوں گے۔ بہت جلد اُگا دیتا ہے لیکن اگر اُس زمانہ میں تربیت نہیں ہوتی۔ تو پھر بہت ہی کم فائدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں۔ عادت میں مضبوطی آتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ آخر کار عادت طبیعت سے مل جاتی ہے۔ اور طبیعتِ ثانی کہلاتی ہے۔ جس کا بدلنا نہایت ہی دشوار ہوتا ہے۔ (ایضاً)

(۱۶۲) تربیت کامل کیلئے جیسا کہ علوم مفیدہ کا پڑھنا شرط ہے۔ ویسا ہی اُس کیساتھ لڑکے کی زندگی کا ایسے طور پر اور ایسی حالت پر بسر ہونا ضرور ہے۔ جس سے روز بروز اُسکے خیالات کو وسعت ہوتی جاوے۔ اُس کی اُمنگ بڑھتی جاوے۔ اُس کے قوےٰ شگفتہ و شاداب رہیں۔ غیرت جو ایک بڑا جوہر انسان کا ہے۔ اور بُرائیوں سے بچانے کیلئے نہایت عمدہ اور سچا محافظ ہے ہمیشہ ترقی پر رہے۔ ظاہری اخلاقی اور مودبانہ حرکات اوپر اوپر مثل روغن قاز کے نہ لگائے جاویں۔ بلکہ مثل چشمہ شیریں کے خود اندر سے نکلیں۔ (ایضاً صفحہ ۵۸)

(۱۶۳) اگرچہ لڑکوں کی تعلیم کا فرضِ مقدم اُن کے ماں باپ پر ہے۔ مگر جیسی تعلیم کہ مطلوب ہے۔ وہ بغیر اِس کے کہ تمام قوم آپس میں متفق ہو کر اُس کو قائم نہ کرے۔ ممکن نہیں ہے۔ اور اِسلئے وہ فرض تمام قوم سے متعلق ہوتا ہے اور کچھ شک نہیں ہے کہ ایسے سامان تعلیم کے موجود نہ ہونے سے تمام قوم گنہگار اور شرمسار ہے۔ اور اِسلئے میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ لوگ ہوشیار ہونگے۔ اور اِس غرض کفایہ کے پورا کرنے پر جو بہ سبب ضرورت وحاجتِ شدیدہ کے رتبہ میں فرضِ عین سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ توجہ فرماویںگے۔ (ایضاً صفحہ ۵۹)

(۱۶۴) علم کی بموجب عمل کرنا ایسی چیز ہے۔ کہ اُسی کے باعث سے یوروپ کو اِس قدر سربلندی حاصل ہوئی ہے۔ جو طبیعت یا رائے کی آزادی کے باعث سے نہایت عمدہ ہو گیا ہے۔ یہ یوروپ کی آزادیٔ طبیعت بہ سبب تہذیب مذہب کے پیدا ہوئی ہے اور اِس تہذیب مذہب کے باعث سے جو لوگ جسم اور روح کی جبر و تعدی میں مبتلا تھے اُس سے آزاد ہو گئے۔ ہماری رائے میں اِس باعث سے یوروپ اُس بڑے درجہ کو پہنچا

نطفہ نہیں رکھتے تھے۔ اُنہیں پر پابند رہنے کے لئے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھ نہ کھولیں۔ اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدائے تعالےٰ کی عجائب قدرت کے نمونہ ہیں اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں۔ اُنکو کیوں نہ دیکھیں۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد اول صفحہ ۱۶)

(۱۵۹) مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گذشتہ اور حال پر نظر کرکے ایک ایسا طریقہ تعلیم معین کرنا چاہئے جس سے علوم دینی اور دُنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔ (ایضاً صفحہ ۱۵)

(۱۶۰) یہ اقتدار اِس ناکامل اور فانی وجود کا جیسا کہ لڑکوں کے تربیت یافتہ یا ناتربیت یافتہ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا اور کسی چیز سے ظاہر نہیں ہوتا جبکہ ہم لڑکوں کی حالت پر غور کرتے ہیں۔ اور اُن کی بھولی بھالی اور سیدھی سادی طبیعتوں کو ہر ایک قسم کے گناہ سے پاک پاتے ہیں۔ اور ہر قسم کی تربیت کی استعداد اُن میں دیکھتے ہیں۔ تو ہم کو خدا کی کامل قدرت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے۔ اور یقین ہوتا ہے۔ کہ وہ اُس ذاتِ کامل کی دی ہوئی بخشش کی ہوئی چیزیں ہیں۔ اُس کے بعد ایک زمانہ تک وہ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ ہمارے سامنے اُنکی عقل وفہم کی ترقی ہوتی ہے۔ اور ہماری تعلیم و تربیت اُن میں اثر کرتی ہے اور یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے اُن میں عمدہ عمدہ عادتیں اور خصلتیں مٹھ جاتی ہیں۔ اور یا بُری بُری نظیروں کے دیکھنے سے شروع ہی سے اُن میں بد عادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی ہیں۔ بہر حال لڑکپن کا موسم نکل جاتا ہے۔ اور جو کچھ لوگوں نے ہماری صحبت اور تربیت سے نیک یا بد حاصل کیا ہو۔ اُس کا اثر دنیا میں رہ جاتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۶)

(۱۶۱) لڑکپن کے زمانہ میں جو عمر کہ سات برس سے پندرہ برس تک ہے۔ وہی ایسا زمانہ زندگی کا ہے جس میں آیندہ کی بہبودی کے لئے زیادہ تر کوشش ہو سکتی ہے اُس زمانہ میں لڑکوں کا دل ہر چیز کا متلاشی رہتا ہے۔ حافظہ تیز ہوتا ہے۔ قوتِ غور مضبوط ہوتی ہے۔ اچھی عادتوں کا دیکھنا اور عمدہ عمدہ نظیروں سے تربیت پانا جس کو عموماً نیک صحبت کہتے ہیں۔ نہایت ہی موثر ہوتا ہے۔ یہ زمانہ لڑکوں کے لئے ذہنی و عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس وقت تعلیم کو دل نہایت جلد قبول کرتا ہے۔ اور اُس کے

شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا اور تکبر اور غرور کو خود پسندی کا منبع بنانا اور اپنے ابنائے جنس سے نفرت کرنا۔ ہمدردی کا نہ رکھنا۔ مبالغہ آمیز باتوں کا عادی کرنا۔ گذشتہ زمانہ کی تاریخ کو بالکل ناتحقیقی میں ڈالنا۔ اور واقعاتِ واقعی کو مثل قصہ و کہانیوں کے بنا دینا سکھاتے ہیں۔ اور یہ تمام باتیں حال کے زمانہ اور حال کے زمانہ کی طبیعت کے مناسب نہیں ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۶۵)

(۱۵۴) انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو۔ مگر جب تک اُس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا۔ اُس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اُس میں چھپی ہوئی ہیں۔ اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۷۴)

(۱۵۵) انسان وحشیانہ طور پر ایک نیک کام کرتا ہے۔ اور جو کہ وہ اصل میں نیک ہوتا ہے لوگوں کے دل میں میٹھا جاتا ہے۔ اور اُس وحشیانہ پنے کی بُرائی جس وحشیانہ پن سے وہ کام ہوا۔ آنکھوں سے چھپ جاتی ہے۔ مگر عمدہ تعلیم میں یہ اثر ہے۔ کہ اُن وحشیانہ حرکتوں کو چھوڑا دیتی ہے۔ اور صرف نیکی ہی نیکی رہ جاتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۷۶)

(۱۵۶) انسان کا ایسے ملک میں پیدا ہونا یا وہاں جاکر رہنا اور تربیت پانا جہاں تعلیم و تربیت کا چرچا ہو۔ اور علم و شائستگی پھیلی ہوئی ہو۔ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے۔ (ایضاً)

(۱۵۷) ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے۔ کہ انسان میں ایک ملکہ اور اُسکی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو۔ تاکہ جو امور پیش آئیں۔ اُنکے سمجھنے کی بُرائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرتِ الٰہی پر فکر کرنے کی اُسکو طاقت ہو۔ اُسکے اخلاق درست ہوں۔ معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے۔ اور امور معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ "ہم کو اِس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں۔ بلکہ ہم اُسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں۔ جو امورِ معاش سے علاقہ رکھتی ہے۔ اور جو منحصر ہے۔ صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر" نہایت بیجا ہے۔ (حیاتِ جاوید حصہ ۲ صفحہ ۱۸۵)

(۱۵۸) ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا۔ جو ہم اُسکے علوم اور اُسکے فلسفہ اور اُسکے الٰہیات کو ناقابلِ غلطی سمجھیں۔ بو علی کچھ صاحبِ وحی نہ تھا کہ اُسکے طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں جو علم دنیوی ہم مدت دراز سے پڑھتے آتے تھے۔ اور جو اپنے زمانہ میں ایسے تھے۔ کہ اپنا

(۱۵۰) بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور سوشیل حالت کی درستی کی ہے۔ جو اب ہی تک نہیں ہوئی یا پورے طور پر نہیں ہوئی۔ (ایضاً)

(۱۵۱) تمام خرابیوں کی جڑ جو ہم پر نازل ہوتی ہیں۔ یہی ہے۔ کہ ہم نے اپنے دل کو اور اپنے اندرونی قوے کو بالکل خراب کر دیا ہے۔ علم جو حاصل کرتے ہیں۔ وہ بھی بعوض اس کے کہ روحانی قوے کو شگفتہ وشاداب کرے۔ اُن کو پژمردہ بلکہ مردہ کر دیتا ہے۔ اور ہمارے قوے کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں۔ بالکل کمزور اور ناکارہ کر دیتا ہے۔ اور ہماری حالت تمام معاملات میں کیا دین کے اور کیا دنیا کی خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔ پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہئے اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہئے۔ جو اندرونی قوے کو شگفتہ وشاداب کرے۔ اور دل کے سوتوں کو کھولکر سرچشمہ سے پانی باہر نکالے جس سے ہماری زندگی سرسبز وشاداب ہو۔ (تہذیب الاخلاق جلد ۳۔ صفحہ ۱۰)

(۱۵۲) یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں۔ اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا۔ کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے۔ لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے۔ اور اپنے دلی قوے کو بیکار ڈال دے۔ تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہوجاتا ہے۔ انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے۔ اور جبکہ اُس کے دلی قویٰ کی تحریک سُست ہوجاتی ہے۔ اور کام میں نہیں لائی جاتی۔ تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑجاتا ہے۔ اور جسمانی باتوں میں مشغول ہوجاتا ہے اور انسانی صفت کو کھو کر پورا حیوان بن جاتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۱)

(۱۵۳) زمانہ اور زمانہ کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہوگئے ہیں۔ ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور اُن کا طرز بیان اور اُن کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہنچانا ذرا بھی تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ برخلاف اِس کے دھوکہ میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو لون۔ مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلاف واقع الفاظ

ترقی کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اور اِسلیئے جو کچھ اُنھوں نے سیکھا ہے۔ اسمیں بھی روز بروز تنزل ہو جاتا ہے۔ (ایضاً)

(۱۴۵) علم مقصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے۔ خواہ تعلیم پانے والے خود اُس پر متوجہ ہوں یا اطفال کے مربیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو۔ یہ ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے۔ کہ ایک جاہل۔ کُندہ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہے اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوتی ہو۔ زندگی کے کاروبار میں اُس کے لئے نہایت مفید و کار آمد ہوتی ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۳۶)

(۱۴۶) تعلیم بغیر اِسکے کہ اُسکے حاصل کرنیکے لئے کوئی زبان اختیار کیجائے غیر ممکن ہے جس زمانہ میں جس زبان کا عروج ہوتا ہے۔ وہی زبان اُس کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ یہ ایک کُلیہ قاعدہ ہے کہ جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے۔ اُسی زبان کا عروج ہوتا ہے۔ (ایضاً)

(۱۴۷) اگلے زمانہ میں تعلیم کا سامان ایسا موجود و مہیا تھا۔ کہ ہر شخص جو علم کی کسی شاخ میں یا شاخوں میں اُس زمانہ کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا اور اُس فن کا ماسٹر ہونا چاہے۔ تو ہو سکتا تھا۔ اور سوسائٹی جو اُس زمانہ میں موجود تھی۔ اُس تعلیم کی مدد کرتی تھی۔ اور اُس پر عمدہ اخلاقی اثر ڈالکر اُسکو اُس سوسائٹی کے لائق کر لیتی تھی۔ اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق اور حسن معاشرت کے ایسی عمدہ تھی۔ کہ اُس میں کوئی نقص اُس زبان میں بھی نہیں نکالا جاسکتا۔ مگر افسوس ہے۔ کہ زمانہ کے انقلاب کیساتھ وہ قائم نہ رہی۔ (ایضاً صفحہ ۱۳۸)

(۱۴۸) ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ عمدہ سوسائٹی اُسکی تعلیم دیتی ہے۔ ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علماء اور نیک خدا پرست رحمدل۔ نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی۔ وہ مدت ہوئی۔ کہ مردہ ہوگئی ہے۔ اور نئی سوسائٹی جو زمانہ حال کے موافق ہو۔ اب تک قائم نہیں ہوئی یا مکمل نہیں ہوئی۔ (ایضاً صفحہ ۱۳۹)

(۱۴۹) اخلاقی اور شریف النفسی کی تعلیم عمدہ سوسائٹی پر منحصر ہے۔ اور انگریزی گورنمنٹ سوائے تعلیم دینے کے اور کوئی طریقہ اختیار نہیں کر سکتی۔ جس سے ہندوستانیوں میں سوسائٹی کی حالت اچھی ہو۔ اور عمدہ سوسائٹی اُن کی بن جائے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۴۰)

تعلیم و تربیت

(۱۳۹) ایک زمانہ ہندوستان پر ایسا گذرا ہے کہ بڑے بڑے پالیٹیشنوں کی یہ رائے تھی۔ کہ ہندوستانیوں کو علوم جدیدہ اور زبان انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دینا نہیں چاہیئے۔ بلکہ اُن کو ایشیائی علوم میں جو محض بے سود ہیں۔ غلطاں اور پیچاں رہنے دینا مناسب ہے۔ تاکہ ہندوستانیوں کو زیر رکھنے اور ہندوستانیوں کو وحشیوں کی حالت سے آگے بڑھنے اور اُن کی آنکھ نہ کھلنے دینے کو اس سے بہتر کوئی پالیسی نہیں ہے۔ (سرسید کے آخری مضامین ۱/۲)

(۱۴۰) ان کے برخلاف چند نیکدل پالیٹیشن ایسے تھے۔ جن کی یہ رائے تھی کہ نہیں ہندوستانیوں کو اعلیٰ تعلیم دینا چاہیئے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے۔ تو اپنا فرض اُن لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے ہم کو حکومت دی ہے۔ ادا نہیں کریں گے۔ (ایضاً)

(۱۴۱) چند سال تک پہلوں کی رائے غالب رہی۔ اور ایشیائی علوم اور ایشیائی زبانوں کی تعلیم پر بڑی سرگرمی رہی۔ آخر کار پچھلوں کی رائے غالب آئی جس کا نتیجہ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کا قائم ہونا ہے۔ مگر یہ مت سمجھو۔ کہ پہلی رائے معدوم ہوگئی۔ بلکہ ابتک موجود ہے۔ اور اُسکے پھر زندہ ہونے کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ وہ پھر زندہ ہو جاوے۔ یا زندہ ہوگئی ہو۔ (ایضاً)

(۱۴۲) اعلیٰ تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطی کی طرح یاد کر لینے اور امتحان دے دینے اور انگریزی میں (آئی ٹی ٹیل) بول لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کیلیئے سب سے بڑی تعلیم دینے والی عمدہ سوسائٹی ہے۔ جس کا وجود ہندوستان میں نہیں ہے اور شاید صدیوں تک ابھی نہیں ہونے کا۔ (ایضاً)

(۱۴۳) تربیت تعلیم کا بڑا رکن ہے۔

(۱۴۴) ہندوستان کے طالب علم جو کچھ اپنا علم کالجوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اُس کی

قربانی نہ کرنا اُس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے ۔ (سرسید کے آخری مضامین صفحہ ۵۶)

(۱۲۸) انسان کے گناہوں کے کفارہ میں قربانی کرنا اور انسان کے جُرم کے سبب ایک جانور کی جان مارنا اور یہ سمجھنا کہ انسان اُس گناہ سے پاک ہوگیا ایک عجیب و غریب خیال ہے ۔ جو نہایت تاریکی اور جہالت کے زمانہ میں لوگوں کو پیدا ہوا تھا ۔ عام جاہلوں کے خیال کا بقیہ ہر ایک زمانہ میں چلا آتا ہے اور کیسا ہی بڑا مصلح ہو کچھ نہ کچھ اُس کا دھبہ اُس کے زمانہ میں بھی باقی رہتا ہے ۔

کسی قربانی کا حکم بطور انسانی گناہ کے کفارہ کے قرآن مجید میں نہیں آیا ہے ۔ حج کی قربانیاں درحقیقت مذہبی قربانیاں نہیں ہیں ۔ نہ اُن کی فرضیت قرآن مجید سے یا نص صریح سے پائی جاتی ہے ۔ یہی سبب ہے ۔ کہ ہمارے علماء مجتہدین نے کتب فقہ میں کسی قربانی کو فرض نہیں قرار دیا ہے ۔ زیادہ سے زیادہ جو کوشش کی ہے تو واجب لکھا ہے ۔ اور ہم کو اس میں بھی کلام ہے ۔

اسلام نے کوئی قربانی بطور تقرب الی اللہ یا بطور کفارۂ گناہ مقرر نہیں کی یہودی سمجھتے تھے ۔ کہ بدوں قربانی سوختنی انسان پاک ہو نہیں سکتا ۔ پھر وہ کیونکر ایسے نبی پر ایمان لاتے جس کے ہاں انسان کے گناہوں کے کفارہ کے لئے نہ قربانی تھی نہ قربانی سوختنی ۔ وہ سمجھتے تھے ۔ کہ اگر ہم ایسے نبی پر ایمان لائے ۔ تو گناہوں سے کیونکر پاک ہونگے ۔ مگر وہ نہ سمجھے کہ اسلام نے گناہوں سے پاک ہونے کیلئے کسی بیگناہ جانور کے مارنے کے بدلے خود گنہگار کے دل کی قربانی مقرر کی ہے ۔ جس کو مذہبی اصطلاح میں توبہ و استغفار سے تعبیر کیا ہے ۔ اور یہی قربانی حقیقت میں حقیقی قربانی ہے ۔

(تفسیر القرآن جلد ۲ ۔ صفحہ ۹۳)

ملک کی ہوا اور پیداوار کھائیں۔ اسی زمین پر جئیں اور اسی پر مریں۔ اِن واقعات سے
خدا کی یہ مرضی پائی جاتی ہے۔ کہ یہ دونوں گروہ اسی ملک میں باہم دوست ہوکر بلکہ دو بھائی
کی طرح ہندوستان میں رہیں۔ ہندوستان کے خوبصورت چہرے کی یہ دونوں دو آنکھیں
ہیں۔ یہ دونوں قومیں جو دال چاول کی طرح سے مل گئیں ہیں متفق ہوکر رہیں۔ جب تک
یہ اتفاق نہیں ہوتا بیشک قومی تعلیم کا بھی بندوبست نہیں ہوسکتا۔ اگر ہندو اپنے دو
پتھروں کی اور مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا جدا عمارت بنائیں گے۔ تو کچھ نہ ہوسکیگا
اِن دونوں کو چاہئیے۔ کہ متفق ہوکر پہلے ایک کام کو پورا کریں۔ اور جب وہ ختم ہوجاوے
تب دوسرے میں ہاتھ لگائیں۔ مجھ کو اِس بات کے ظاہر کرنے میں خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے
کالج میں ہندو بھائیوں نے مدد کی ہے۔ اور خدا ترسی کے خیال سے اپنے محتاج بھائیوں
کا حق ادا کیا ہے۔ (مجموعہ لکچرز صفحہ ۲۶۵)

قربانی

(۳۶) ایک سال بقرعید کے موقعہ پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہوکر ایک گائے
قربانی کے لئے خریدی۔ عین بقرعید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں
گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سُنکر وہ از خود رفتہ ہوگئے۔ فوراً سوار ہونے کیلئے
گاڑی تیار کرائی۔ اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگا دی۔ یہانتک
کہ وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اُس کے مالک کو واپس دی گئی۔ اور طالبعلموں
کو سخت ممانعت کی۔ کہ کالج کے احاطہ میں کبھی کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔ (حیات جاوید حصہ ۲۔ صفحہ ۵۲۹)

(۳۷) ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے۔ کہ اگر گائے کی قربانی ترک کر دینے سے
آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو۔ تو گائے کی

(۱۳۲) قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں یوروپ میں مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں گو ان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں غرضیکہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو۔ یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے ہو۔ اسی پر مرتے ہو۔ اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو و مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ تو ان سب کو ملکی فائدہ میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے۔ ایک ہونا چاہیئے۔ (مجموعہ لیکچرز صفحہ ۲۱۲)

(۱۳۳) تمام تربیت اور تعلیم کیساتھ ایک اور بڑا مسئلہ ہے جس کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور اس کی ہندوستان میں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ **باہمی اتحاد** ہے۔ (مجموعہ لیکچرز صفحہ ۲۲۷)

(۱۳۴) مذہبی خیالات کا جدا گانہ ہونا خدا کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی کا کام نہیں کہ سب کو ایک مذہب پر لے آئے۔ یہ تو وہ لوگ بھی نہیں کر سکے۔ جو انبیاء علیہم السلام کے نام سے گذرے ہیں مختلف مذاہب کے لوگ ہونے سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ باہمی اتفاق نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے تمام ہندو اور مسلمان بھائیوں سے یہ کہتا ہوں۔ کہ اس میں شک نہیں۔ یہ امر ناممکن ہے۔ کہ رایوں کا اختلاف دور کیا جاوے۔ آپس میں ایک دوسرے سے رشک وحسد نہ رکھے۔ باہم رنج و آزردگی نہ ہو۔ یہ بھی خدا کا قانون ہے اس کو کوئی نہیں توڑ سکتا مگر جس چیز میں کہ سب کے اغراض متحد ہیں۔ ان سب کا ایک دل ہو جانا یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس کی مثالیں اور ملکوں میں موجود ہیں۔ اس ملک کے بھی کل باشندوں کو ملک کی بہتری کیلئے ایک جان ہو کر کوشش کرنا چاہیئے۔ اگر یہ نہ کرو گے۔ تو ہندو بھی ڈوبیں گے اور مسلمان بھی۔ ان دونوں کی حکومت کے وقت گذر گئے۔ جو کچھ ان وقتوں میں ہوا ہوا۔ (ایضاً)

(۱۳۵) اے صاحبو صدیاں گذر گئیں۔ جب سے خدا کو یہ منظور ہوا۔ کہ ہندو اور مسلمان اسی

اور برتنی چاہئے۔ مگر وہ تمام محبت اور دوستی حُب انسانی کی وجہ پر ہو نہ حُب ایمانی کے۔ کیونکہ حُب ایمانی بلا اتحاد مذہب بلکہ بلا اتحاد مشرب ہونی غیر ممکن ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہی ہدایت ہم کو ہمارے سچے مذہب اسلام نے کی ہے۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۱۱۳)

(۱۲۹) انسان کو لازم ہے کہ تمام جہاں کے انسانوں کی بھلائی چاہے۔ اگر ہم ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھیں۔ تو جان لیں گے۔ کہ ہم سب آپس میں بھائی ہیں۔ اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔ گو آفتاب کی تیزی نے کسی ملک میں ہم میں سے کسی کا رنگ کالا اور کسی ملک میں دھوپ کی نرمی نے کسی کا رنگ گورا کر دیا ہو۔ مگر ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ پس ہم کو بلا تعصب تمام انسانوں کی بھلائی چاہنی چاہئیے۔ (مجموعہ لکچرز صفحہ ۱۰)

(۱۳۰) اے میرے دوستو! تمہارے ملک ہندوستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں۔ جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں جس طرح کہ انسان میں بعض اعضاء رئیسہ ہیں۔ اُسی طرح ہندوستان کیلئے وہی دونوں قومیں بمنزلہ اعضاء رئیسہ کے ہیں۔ ہندو ہونا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے۔ جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ کیا خوب کہا ہے جس نے کہا ہے کہ انسان کے دو حصے ہیں۔ اُس کے دل کا خیال یا عقیدہ خدا کا حصہ ہے اور اُس کا اخلاق اور میل جول اور ایک دوسرے کی ہمدردی اُس کے ابناء جنس کا حصہ ہے۔ پس خدا کے حصہ کو خدا پر چھوڑ دو۔ اور جو تمہارا حصہ ہے اُس سے مطلب رکھو۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۰)

(۱۳۱) بیشک انسانوں میں باہم کبھی کبھی رنج ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔ ہندو اور مسلمانوں پر موقوف نہیں ہے۔ آپس میں ہندو ہندوؤں میں مسلمان مسلمانوں میں۔ بھائی بھائیوں میں۔ باپ بیٹوں میں ماں بیٹیوں میں رنج ہو جاتا ہے۔ مگر اُس رنج کو قائم رکھنا دل میں پکائے جانا اور بڑھائے جانا انسان کی۔ ملک کی۔ قوم کی۔ خاندان کی پوری بدبختی ہے۔ کیا مبارک ہیں وہ لوگ جو معافی چاہتے ہیں۔ اور اُس گرہ کے کھولنے میں جو محبت میں نفاق سے پڑ گئی ہے۔ پیش قدمی کرتے ہیں۔ اور اپنے بھائی یا ہموطن یا ہمقوم سے بے قصور ہونے پر بھی معافی چاہتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۱)

سینکڑوں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے۔ کہ ہم دونوں نے ملکر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی۔ جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔ پس اگر ہم اس حصہ سے جو ہم دونوں میں خُدا کا حصہ ہے۔ قطع نظر کریں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔ اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونیوالے ہیں۔ افسوس ہے۔ اُن لوگوں پر جو اِس نکتہ کو نہیں سمجھتے اور آپس میں اِن دونوں قوموں کے تفرقہ ڈالنے کے خیالات پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے۔ کہ اُس مضرت و نقصان میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ اور آپ اپنے پانوٴں پر کلہاڑی مارتے ہیں۔ (ایضاً)

(۱۲۶) ہم کو اطمینان رکھنا چاہئے۔ کیونکہ جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کرنا سکھایا ہے وہی آگے چل کر اُن کو یہ سبق دیگی۔ کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے ایک دوسرے کے مصلح کو ملحوظ نہ رکھیں گے۔ تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔ (حیات جاوید حصہ ۱ صفحہ ۴۴)

(۱۲۷) ہم کو ایسا لایق ہونا چاہئے۔ کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے قابل ہوں۔ ہم بساطی کی سی دکانداری نہ کریں۔ ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں ہماری تجارت کی محمڈن اینڈ ہندو کمپنی کے نام سے کوٹھیاں لنڈن میں۔ ایڈنبرا میں ڈبلن میں۔ برسلز میں۔ سینٹ پیٹرسبرگ میں۔ برلن میں۔ وائنا میں قسطنطنیہ میں پیکن میں واشنگٹن میں اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں۔ اور ہم بحری و بری سفر اُسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں جس سے ہم کو عزت۔ دولت حشمت اور حکومت میں شوکت حاصل ہو۔ (حیات جاوید حصہ ۲۔ صفحہ ۱۱۷)

(۱۲۸) پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے یہ اُن کی غلطی ہے۔ جو چیز کہ خدائے تعالےٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے۔ وہ برحق اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے گو وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی

کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو۔ کہ ایک دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں اُن میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے۔ اور کوئی کسی کو۔ مگر اس اختلاف طبائع کی وجہ سے اُس دستر خوان پر بیٹھنے والوں کو کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اُس پر مجبور ہے۔ اسلئے کہ جس چیز کا یقین اُس کے جی میں ہے۔ اُسی کو وہ اختیار کریگا۔ وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ اچھا ہے تو اس کیلئے اور بُرا ہے تو اس کے لئے لیکن آپس کی محبت میں جمع انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے۔ اُس سے کچھ نقصان نہیں آتا۔ (حیات جاوید حصہ ۲ صفحہ ۵۵۰)

(۱۲۳) ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں۔ کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں۔ ایک دریا کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں۔ ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے بغیر ملے چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو۔ جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہو۔ اِن دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔ (ایضاً)

(۱۲۴) قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو اُن میں بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونو نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو۔ کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں۔ اِس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۵۵۱)

(۱۲۵) اب ہندوستان ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی

کامل ترقی سے تعبیر نہیں کرینگے۔ کیونکہ غیر ملک والے ہم سب کو خواہ ہم مسلمان ہوں خواہ ہندو
(مجھے معاف کیجئے کہ میں بھی لفظ ہندو کو اِس خاص معنی میں استعمال کرتا ہوں) ایک لفظ
ہندوستانی سے نامزد کرتے ہیں اور ہماری ترقی و تنزل علیحدہ علیحدہ اہلِ ہنود و اہلِ اسلام
کی ترقی و تنزل سے نامزد نہیں ہوتی۔ بلکہ کل ہندوستان کی ترقی و تنزل سے تعبیر ہوتی ہے (ایضاً صفحہ ۱۳۹)

(۱۱۹) یہ سمجھنا۔ کہ میری ہندو بھائیوں کیساتھ ہمدردی نہیں ہے۔ یا میں اپنے ہم مذہب
لوگوں کی بھلائی میں ہی کوشش کرتا ہوں غلط ہے۔ ایسا خیال میرے دل میں نہ کبھی پیدا ہوا
ہے نہ آیندہ ہوگا۔ میں دل و جان سے دونوں قوموں کیواسطے یہ تجویز کرنا چاہتا تھا۔ مگر جب
حالتِ موجودہ اسکے موافق نہ تھی۔ تو لاچار مجھے اپنی تجویز کو کسی قدر محدود کرنا پڑا۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۱)

(۱۲۰) اہلِ ہنود صاحبان صرف اپنے تئیں ہندو یعنی باشندۂ ہند خیال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ
ہوتا ہے۔ کہ وہ مسلمانوں کو اجنبی خیال کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں
ہندو یعنی اہلِ ہند کے خطاب کے مستحق ہیں صاحبو! وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب
کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جاویں۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۳)

(۱۲۱) لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جسمیں میں لفظ
نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے۔ کہ اُن کا
مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ کیونکہ ہم اُس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں
وہ یہ ہے۔ کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی حاکم
کے زیرِ حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبتوں کو
برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بناء پر میں اُن دونوں قوموں کو
جو ہندوستان میں آباد ہیں۔ ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندوستان کی رہنے
والی قوم جس زمانہ میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھکو خاص اسی قوم کی بہبودی کی دل سے
فکر تھی۔ (ایضاً صفحہ ۱۶۷)

(۱۲۲) میری تمام آرزو یہ ہے۔ کہ بلالحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے
کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بیشک علیحدہ علیحدہ ہے۔ مگر اُس کے لحاظ سے آپس میں

کا لقب دونوں کو برابر ملتا ہے۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں۔ ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں۔ ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں۔ ایک ہی طرح وسائل ترقی دونوں کے لئے موجود نہ کئے جاویں۔ ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ (ایضاً صفحہ ۷۶)

(۱۱۶) میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں۔ جنہوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسہ کی عمارت کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہیگی۔ کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی۔ (ایضاً)

(۱۱۷) مجھے امید ہے۔ کہ ہندوستان جس میں خدا نے ہم کو اور ہمارے ہندو بھائیوں کو آباد کیا ہے جس سے اس کا منشاء پایا جاتا ہے۔ کہ ہم دونوں گروہ بھائی ہو کر اور ایکدوسرے کو بھائی سمجھ کر ایکدوسرے کی مدد کریں۔ روز بروز ترقی کریگا۔ پنجاب اور پلیٹ فارم کو دو اسپر یکجائی مجمع ان دونوں گروہوں کا دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے۔ اسی چیز کی ہندوستان میں ضرورت ہے۔ میرے یہاں آنے میں دونوں نے ایک ساتھ خوشی کی اور ایک ہی ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جس سے میری امید کو بہت تقویت ہوتی ہے میری دعا ہے۔ کہ خدا ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں ایکدوسرے کی مدد کا خیال پیدا کرے۔ اور ایک کو دوسرے کا حامی کرے۔ آمین۔ (ایضاً صفحہ ۸۶)

(۱۱۸) آپ نے جو لفظ ہندو کا استعمال فرمایا ہے۔ وہ میری رائے میں درست نہیں کیونکہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے۔ کہ آپ مجھکو باوجود اسکے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ ہندو نہیں سمجھتے۔ آپ اس بات کو جانتے ہونگے۔ کہ ہندوستان کی ترقی کیلئے یہ بات ضروری ہے۔ کہ اہل ہنود اور اہل اسلام باہم ملکر کام کریں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا۔ اس ترقی کو جو ایک قوم کریگی۔ ہندوستان کی

مذہب کے نہیں ہوسکتی۔ مگر اس حال کے سُننے سے جو جے پور میں ہوا۔ مجھے یقین ہوگیا۔ کہ میرا یہ خیال غلط تھا۔ اور میں اپنے اِس خیال کے غلط نکلنے سے بے انتہا خوش ہوا ہوں۔ اور خود اپنے کو آپ مبارکبادی دیتا ہوں۔ (تہذیب الاخلاق جلد ۳۔ صفحہ ۱۸۱)

(۱۱۳) میری یہ سمجھ ہے۔ کہ ہندوستان میں دو قومیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر ایک قوم نے ترقی کی اور دوسری نے نہ کی۔ تو ہندوستان کا حال کچھ اچھا نہیں ہونے کا۔ بلکہ اُس کی مثال ایک کانڑے آدمی کی سی ہوگی۔ لیکن اگر دونوں قومیں برابر ترقی کرتی جاویں تو ہندوستان کے نام کو بھی عزت ہوگی اور بجائے اسکے کہ وہ ایک کانڑی اور بڈھی۔ بال بکھری۔ دانت ٹوٹی بیوہ کہلاوے۔ ایک نہایت خوبصورت پیاری دُلہن بن جاویگی۔ او خدا تو ایسا ہی کر۔ آمین۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۹۲)

(۱۱۴) میں اس اسکول کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کہ اِس میں ہندو اور مسلمان دونوں قوم کے لڑکے شامل ہیں۔ ہندو ہمارے ہموطن بھائی ہو گئے ہیں جس نے جامۂ انسانیت پہنا ہے۔ اُسکی یہ خواہش ہوگی۔ کہ ہندوستان میں دونوں قومیں برابر ترقی کریں۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا ہندوستان کی کوئی قوم ہو۔ ملک کی بہتری کیلئے سب کو ایک ہونا چاہئے۔ اسکول کے طالبعلموں میں علاوہ ہموطن بھائی ہونیکے اسکول بھائی ہونیکی بھی صفت ہوتی ہے۔ (سفرنامہ پنجاب صفحہ ۱۴۵)

(۱۱۵) مدرسۃ العلوم بیشک ایک ذریعہ ترقی قومی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے۔ بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت درست کرنے کیلئے اور جو افسوسناک محرومی اُن کو یوروپین سائنز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی۔ اُسکے رفع کرنے کو قائم کیا گیا۔ مگر اُس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں۔ اور تربیت جو ہندوستان میں مفقود ہے۔ دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں۔ مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدابخش اور گنگارام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ غیر ملکوں میں جب ہم لوگ جاتے ہیں۔ تو ہندو اور مسلمان کے نام سے نہیں پکارے جاتے ہیں۔ بلکہ نیک دل لوگوں سے ہندوستانی کا اور تنگدل لوگوں سے نیگرو یعنی کالے منہ یا وحشی ہندوستانی

ان کے ہندوستان میں آباد ہونے کو زمانہ کثیر گذر گیا جس کے سبب وہ ہندوستان کے متوطن اور ہندوستان کے رہنے والے ہندو کہلائے۔

مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ اُنکی بھی بہت پشتیں ہندوستان کی زمین پر ہی گذری ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جنمیں آریاؤں کے خون کا بھی میل ہے۔ بہت سے ایسے ہیں۔ جو خالص آریا کہلاتے ہیں۔

صدیاں گذر گئیں۔ کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔ ایک ہی زمین یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔

جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاتے ہیں۔ (سرسید کے آخری مضامین صفحہ ۵۵)

(۱۰۹) ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے۔ کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلھن ہے۔ اور ہندو اور مسلمان اُس کی دو آنکھیں ہیں۔ اُسکی خوبصورتی اس میں ہے۔ کہ اُسکی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر اُن میں سے ایک برابر نہ رہی۔ تو وہ خوبصورت دلھن بھینگی ہو جاویگی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی۔ تو کانی ہو جاوے گی۔

(۱۱۰) ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے۔ بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئیں ہیں۔

پس جس قدر اِن دونوں قوموں میں زیادہ تر محبت۔ زیادہ تر اخلاص۔ زیادہ تر ایکدوسرے کی امداد بڑھتی جائے اور ایک دوسرے کو مثل بھائی کی سمجھیں کیونکہ ہموطن بھائی ہوتے ہیں تو کچھ شبہ نہیں ہے اُسی قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے۔ (ایضاً)

(۱۱۱) ہماری رائے میں اختلاف مذہب جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہے۔ سوشیل برتاؤ اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً صفحہ ۵۶)

(۱۱۲) درحقیقت ہمارے لئے اور بخصوص میرے لئے یہ بات نہایت خوشی کی ہے۔ اسلئے کہ میں ہمیشہ یہ خیال رکھتا تھا۔ کہ ہمارے ہندو بھائیوں میں سولیزیشن کی ترقی مع قیام اُن کے

(۱۰۷) مجھ کو یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے عام قانون میں دخل ہوگا۔ اُس وقت تک دونوں قوموں (انگریز و ہندوستانی) کے درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم رہیں گی۔ زندگی سوشل خوشی اور موافقت پولیٹیکل ہمسری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے اور ایک ہی عدالتوں کے تابع رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اِس قدر عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا اگر زمانۂ قدیم کے مُقنن برہمن کے واسطے ایک قانون اور شودر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے۔ زمانہ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مائی لارڈ! میں امید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گذر جانے سے ہم اب شائستگی کے اُس درجہ کو پہنچ گئے ہیں جبکہ قومی امتیازات کو بہرکیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے۔ مائی لارڈ! مجھ کو اپنی طرف سے تو یہ مستحکم یقین ہے۔ کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ یوروپین ہوں یا یوریشین اِس بات کو سمجھنے لگے ہیں۔ کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور اُن کے پولیٹیکل حقوق یا کانسٹیٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ اور ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کی تحت میں حفاظت کا استحقاق جو اُنکو حاصل ہے۔ وہ کچھ اُن کی قوم یا اُن کے مذہب کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اُس بڑے حق کے سبب سے ہے جس میں سب شریک ہیں یعنی ایک جلیل القدر شاہنشاہ کی وفادار رعایا ہونے کے حق کے سبب سے۔

(ایضاً صفحہ ۱۶۷)

ہندو مُسلمانوں کا اتحاد

(۱۰۸) جس قدر سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و ارتباط ہندو مسلمانوں میں ترقی پکڑتا جاوے ہم کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی آریہ قومیں بھی خاص ہندوستان کی رہنے والی نہیں ہیں۔ دوسرے ملک سے آکر ہندوستان میں تمدنی کیساتھ آباد ہوئی ہیں

کرتا ہے۔ پس ایسی صورت میں ذہین اور دانشمند لوگوں کی آزادی اور جان کی حفاظت بالکل جاتی رہتی ہے جبکہ حاکم کو اُن کی نام آوری اور شہرت سے حسد ہونے لگتا ہے چنانچہ جب رومیوں میں شہنشاہی قائم ہوئی تو غلام بنانے کے دستور سے اور آزادی کے جاتے رہنے سے اُن کی شائستگی بالکل معدوم ہوگئی۔ (ایضاً صفحہ ۶۵)

(۱۰۴) میرا یہ خیال ہے۔ کہ جس گورنمنٹ کی رعایا کے دل میں یہ بات ہو کہ گورنمنٹ خوشامد کی بات سے خوش اور ہر خلاف بات سے ناراض ہوگی۔ تو اُس سے زیادہ بدتر کوئی گورنمنٹ نہیں ہوسکتی۔ اگر انگلش گورنمنٹ ایسی ہو۔ تو اُس کی حکومت اور ایک ناتربیت یافتہ گورنمنٹ کی حکومت میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ (ایضاً صفحہ ۱۰۳)

(۱۰۵) میں غالباً اُن شخصوں کیساتھ اتفاق نہیں کرسکتا ہوں۔ جو لوکل فنڈ اور معاملات مختص المقام کے انتظام سے گورنمنٹ کا علیحدہ ہونا بُرا سمجھتے ہیں اور بلحاظ اصول کے بالطبع میری یہ خواہش ہونی چاہئے۔ کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں حتی الامکان وہ شخص شریک ہوں۔ جو رعایا کی رائے سے بطور اُن کے حامیوں کے منتخب کئے گئے ہوں۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۳)

(۱۰۶) جس چیز کی لوگ اُن ملکوں میں اطاعت کرتے ہیں جنکو شائستہ گورنمنٹ کی برکت حاصل ہے۔ وہ کچھ خاص خاص شخصوں کی حکومت نہیں ہے۔ بلکہ وہ قانون کے احکام ہیں جب تک کہ قانون منصفانہ اور بے طرفدار اور بارحم ہوگا۔ اور جب تک اُس قانون کا عملدرآمد ٹھیک ٹھیک طور پر کیا جائے گا اُس وقت تک اُن شخصوں کی قومیت جو قانون کی تعمیل کریں۔ باریک خیالوں کے نزدیک بھی چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہونی چاہئے۔ جس چیز کی تعظیم اور ادب اور اطاعت درکار ہے وہ قانون کی حکومت ہے۔ نہ کہ خاص خاص شخصوں کی۔ اور اگر وہ شخص جو ہندوستان کے باشندوں کو اپنی برابری کا مستحق نہیں سمجھتے ہیں۔ اس معاملہ پر ذرا تامل کیساتھ غور کریں گے۔ تو اُن کو بھی یہ بات معلوم ہوجاوےگی کہ ہندوستانی مجسٹریٹ گورنمنٹ کے نوکر ہیں جن کے متعلق گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ (مجموعہ لکچرز۔ صفحہ ۱۶۹)

ہی کی آب وہوا سے بن گیا ہے۔ اسلئے وہ بھی ہندوستان کی ایک مشابہ قوموں میں
داخل ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۸)

(۱۰۱) ملکی فخر سے وہی فخر مراد ہے۔ جو ہندوستان کی تمام موجودہ قوموں کی مجموعی تربیت اور شائستگی سے بلالحاظ اُنکے مذہب اور اُنکی اصلیت کے ملک کو حاصل ہو۔ کیونکہ اگر اس لفظ کا یہ مطلب نہ سمجھا جاوے۔ تو ملکی فخر کے لفظ کا استعمال صحیح نہ ہوگا۔ اور نہ ملکی فخر باقی رہیگا بلکہ خاص خاص قوموں کا فخر کہلائے گا جس کا حاصل ہونا نیچر کی رو سے بغیر ایکدوسرے کی ہمدردی اور مددگاری کے غیر ممکن ہے۔ اور اس کا نتیجہ بجز ملکی ذلت کے اور کچھ نہیں (ایضاً)

(۱۰۲) اکثر آدمی اس قسم کے ہوتے ہیں۔ کہ اپنے پُرانے طریقوں پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں مگر اُن کو غور کرنا چاہئے۔ کہ یہ معاملہ ویسا نہیں ہے۔ کہ ہم پیغمبروں یا دیوتاؤں نے دیا ہو۔ انسان کی رائیں اگرچہ اس وجہ سے کہ وہ ہمارے بزرگ تھے۔ معزز ہوں۔ مگر درحقیقت ریت کی بنیاد ہے۔ اور ہمیشہ زیادہ تر تحقیقات اور توجہ کی لائق ہے تاکہ نیچر یعنی قواعد قدرت سے اُس کی بخوبی آزمائش کی جاوے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۹)

(۱۰۳) حاکم کو جو رعایا پر ایک کامل اور غیر محدود اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اور جو چیزیں رعایا کی ذات سے متعلق ہیں۔ اُن سب پر اُس کو تصرفِ کامل حاصل ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے وہ اپنی رعایا کیساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے۔ جیسا کوئی اپنے باپ دادے کے ترکہ پر۔ پس اِس صورت میں کوئی شخص گو اُس پر ہمیشہ یکساں ظلم نہ رہے اپنی زندگی کو اس طرح پر بسر نہیں کرسکتا۔ جس سے وہ ہر مرتبہ کمال کو پہنچ سکے۔ اِسلئے کہ ہمیشہ اُس کے دل میں اپنے حاکم کی طرف سے ایک ایسا خطرہ لگا رہتا ہے۔ جو اُسکی آزادی کا مانع ہوتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ آخر کار میرا اس حاکم کا شکار اور غلام ہونگا۔ اور ایسی سلطنتوں میں جہاں بادشاہ بالکل خود مختار ہوتا ہے۔ یہ دستور ہے کہ جو کاریگر کوئی عمدہ صنعت یا کوئی ہنر ایجاد کرے۔ بادشاہ وقت اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے چنانچہ ایسی سلطنت کا شاعر بھی اپنی خیال بندی میں اُسی کا تابع ہوتا ہے اور بیچارہ کاریگر بھی اپنی تمام محنت و مشقت کو اُسی کے فائدہ کے واسطے دیتا ہے۔ غرضیکہ جب حاکم کو ایسے عملدرآمد سے لطف آتا ہے۔ تو وہ ہمیشہ اپنے اختیار کو اسی طرح سے صرف

کا ہے کہ وہ رعیت گورنمنٹ کی خیرخواہ نہیں ہے۔ اور ہندو راجپوت اس رنج کے دور کرنے
کے لئے اور کچھ فکر پالیسی تو قع میں ہے۔ پس رعیت کا باادب اور مخلصانہ نیک نیتی
سے اپنے تمام رنجوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا اور اپنے تمام حقوق کا نہایت مضبوطی اور
استقلال سے اپنی گورنمنٹ سے دعوے کرنا ایک بہت بڑا ثبوت خیرخواہی کا ہے۔ (مجموعہ لکچرز صفحہ ۲۶)

(۹۷) ہندوستان کی رعایا کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ کہ گھر میں بیٹھکر گورنمنٹ کی ہزاروں
شکایتیں کرینگے۔ انتظام حکام پر اپنے گھر میں ہزار عیب لگاویں گے جن میں سے بہت سے
صحیح اور درست بھی ہونگے مگر جب انگریزوں سے ملیں گے تو کہیں گے۔ کہ ہم تو گورنمنٹ کے
بڑے خیرخواہ ہیں۔ اور حکام کا انتظام حد تعریف سے بھی بہت عمدہ ہے۔ اور نہایت ہی خوب
ہے۔ کوئی عقلمند آدمی ایسی رعیت کو خیرخواہ نہیں سمجھ سکتا۔ (ایضاً صفحہ ۲۷)

(۹۸) تم خوب سمجھ لو۔ کہ اگر تم خود کوشش نہ کروگے۔ تو کوئی تمہارے واسطے کوشش
نہ کریگا۔ تم کیوں اتنا ڈرتے ہو۔ تم مجھ پر خیال کرو۔ کہ میں بھی مثل تمہارے گورنمنٹ کی ایک
ادنے رعیت میں سے ہوں۔ بلکہ مجھ پر ایک اور زیادہ اطاعت گورنمنٹ کا بوجھ ہے۔ کہ
میں نوکر بھی گورنمنٹ کا ہوں۔ مگر دیکھو اس عام مجلس میں کیسی علانیہ گفتگو کر رہا ہوں۔ (ایضاً)

(۹۹) ملکی فخر سے وہ فخر اور عزت مراد ہے۔ جو کسی ملک کے رہنے والوں کو عام تربیت اور
شائستگی کے پھیلنے سے بلا لحاظ مذہب اور قوم کے حاصل ہوتی ہے۔ ہم لوگ اہل یورپ
کو ایک شائستہ اور تربیت یافتہ قوم کہتے ہیں۔ اور انکی نسبت ہر طرح کا ملکی فخر و امتیاز
منسوب کرتے ہیں۔ وہ لوگ نہ ایک قوم ہیں اور نہ ایک مذہب رکھتے ہیں۔ مگر انہوں نے
اپنے ملک میں بلا لحاظ قوم و مذہب کے عام تربیت اور شائستگی پھیلانے سے ملکی فخر و امتیاز
کا خطاب حاصل کیا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۰)

(۱۰۰) مسلمان قوموں کی اصلیت کچھ ہی ہو۔ مگر ایک مدت دراز کی سکونت اور توطن اختیار
کرنیکے سبب نیچر نے اُن کے خون کو انکی اصلیت کو بدل دیا ہے۔ اور جس طرح اور قومیں
ہندوستان میں آکر آباد ہوئیں۔ اور ہندوستان کی ایک مشابہ قوموں میں داخل ہوگئیں اسیطرح
مسلمانوں کا خون اور گوشت اور پوست ہندوستان ہی کی پیداوار ہے۔ اور ہندوستان

" ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں۔ کہ اگر ہم محنت کئے جاویں اور اپنی "
" قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں۔ تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آئندہ "
" کی قومی ترقی اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا "
" ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی ولولہ اور محنت سے کام کئے جائیں گے۔ تو مجھے پورا "
" یقین ہے۔ کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام "
" خوشی و آزادی کی ہو جاوے گی۔ " (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۱۳۰)

(۹۴) ملک جب نامہذب ہوتا ہے۔ تو ضرور کچھ نہ کچھ گورنمنٹ میں ناتہذیبی آجاتی ہے۔ اور جب گورنمنٹ مہذب ہوتی ہے۔ تو کسی نہ کسی قدر تہذیب ملک میں ہوتی جاتی ہے۔

ملک کا نامہذب ہونا تو اس ملک کے باشندوں کا نامہذب ہونا ہوتا ہے۔ کیونکہ جب یہ کہیں۔ کہ انگلینڈ۔ فرانس۔ جرمنی۔ امریکہ نہایت مہذب ملک ہیں۔ تو اسکے معنی یہی ہونگے۔ کہ وہاں کے رہنے والے تہذیب و تربیت یافتہ ہیں۔ ہندوستان کو جو نامہذب یا نیم وحشی ملک بتایا جاتا ہے۔ اس کا یہی سبب ہے۔ کہ یہاں کے رہنے والے نامہذب یا نیم وحشی گنے جاتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۳۵)

(۹۵) تم میری اس پیشینگوئی کو یاد رکھو۔ کہ وہ دن کچھ دور نہیں ہے۔ کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کونسل میں داخل ہونا ضرور ہوگا۔ وہ دن آویگا۔ کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے۔ اور خود ہی اُس پر عمل کرو گے۔

(۹۶) کوئی عقیل گورنمنٹ ایسی رعیت کو جیسے کہ بالفعل تم ہو۔ ہرگز پسند نہیں کرتی۔ اور تم کیسے ہی مسکین بنو اور ہاتھ جوڑو۔ ایسی حالت میں جس میں کہ تم اب ہو کبھی تم کو ایک عقلمند گورنمنٹ اپنا خیر خواہ نہیں سمجھ سکتی۔ ممکن نہیں ہے۔ کہ گورنمنٹ کا کوئی حکم گو وہ کیسی ہی نیک دلی سے جاری ہو اور خصوصاً ایسی حالت میں جو بلا مشارکت رائے اور بلا مشورہ رعایا کے ہو برخلاف مرضی رعایا کے نہ ہو۔ اور رعایا کو گورنمنٹ کے کسی حکم سے بھی ناراضی نہ ہو پس اگر رعایا اُس ناراضی کو چھپائے۔ اور اسکو علانیہ گورنمنٹ کے سامنے پیش نہ کرے اور دل ہی دل میں رنج کئے اور ظاہر میں ہاتھ جوڑے۔ تو یہ علانیہ ثبوت اس بات

کسی بات پر ووٹ دیدینے سے گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو۔ قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ بلکہ خود اُس کے چال چلن پر۔ اُس کے برتاؤ پر بھی اُس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا۔ تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بات بے شبہ ہے۔ کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنی قوتوں کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۸)

(۹۱) کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو سُست آدمی کو محنتی فضول خرچ کو کفایت شعار۔ شرابخوار کو تائب نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ باتیں شخصی محنت۔ کفایت شعاری نفس کُشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی۔ قومی عزت۔ قومی اصلاح۔ عمدہ عادتوں۔ عمدہ چال چلن۔ عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے۔ نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے سے۔ (ایضاً)

(۹۲) کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اُس ملک کی رعایا کے چال چلن۔ اخلاق و عادات۔ تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت اُن مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے۔ جن سے ہر قوم بنی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۹)

(۹۳) مستقل اور مضبوط آزادی۔ سچی عزت۔ اصلی ترقی۔ شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے۔ اور وہی شخصی چال چلن۔ معاشرت و تمدن کا محافظ اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجراء کی خواہش یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے سچا اصول وہ ہے۔ جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا۔ جو ایک بڑا خیر خواہ آیرلینڈ کا تھا۔ اُس نے کہا کہ

"جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں۔ اُس وقت مجھکو میرا ملک اور میرے شہر"
"کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی باتیں سُنتے آئے"
"ہیں۔ مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے۔ کہ ہماری محنت۔ ہماری آزادی"

ہیں۔ تو اُس صورت میں غلطیاں سختی پکڑ کر تعصب بن جاتی ہیں۔ اور سچ میں بھی سچ کا اثر اسلئے باقی نہیں رہتا۔ کہ اُس میں مبالغہ ہوتے ہوتے وہ خود ایک جھوٹ بن جاتا ہے۔ انصاف کی قوت جو انسان میں ہے۔ وہ اُس وقت بخوبی کام میں آتی ہے کہ ہر ایک معاملہ کے دونوں پہلوؤں کے حامی اور معاون تصفیہ کے وقت روبرو موجود ہوں۔ اور وہ دونوں ایسے زبردست ہوں۔ کہ اپنے اپنے دلائل اور وجوہات کی سماعت پر لوگوں کو گویا مجبور کر دیں۔ اور سوائے اِسکے اور کوئی صورت حق کے حاصل کرنیکی نہیں ہے۔ (ایضاً صفحہ ۶۸)

(۸۹) اِس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ لوگوں کا یہ خیال۔ کہ بادشاہِ وقت ہم کو بتا دے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے۔ اور جس قدر کہ ہندوستان میں۔ بلکہ تمام ایشیا میں اور ٹرکی اور ایجپٹ میں بھی ناشائستگی اور ناتہذیبی ہے۔ اُس کا بڑا سبب یہی خیال ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اِسی خیال نے غارت اور برباد کیا ہے اور یہی خیال ہے۔ جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا ہے پس جب تک یہ خیال نہ جاویگا۔ اور یہ خیال نہ آویگا۔ کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس وقت تک ہندوستان کی رعایا کو اور خصوصاً مسلمانوں کو نہ دولت ہوگی نہ حشمت۔ نہ عزت ہوگی نہ منزلت۔ نہ تہذیب ہوگی نہ شائستگی۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۷)

(۹۰) ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں۔ کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یوروپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ یوروپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا کر کے اُن کا درجہ سب سے اعلےٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔ ایک شخص فرض کرو۔ کہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہو جائے یا کلکتہ میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جائے۔ قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتا ہے۔ برس دو برس میں

باتیں بے سمجھے اور بغیر دلیل کے اور بغیر مباحثہ کے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں۔ مگر اُن کا صحیح اور درست ہونا ضرور نہیں۔ سچ میں کوئی ایسی اعجازی کرامات نہیں ہے کہ وہ از خود دلوں میں بیٹھ جاوے۔ اُس میں جو کچھ کرامات ہے۔ وہ صرف اسی قدر ہے کہ مباحثہ کا اُس کو خوف نہیں۔ سچ رائے بھی اگر بلا دلیل و مباحثہ دل میں گھر کرے۔ تو وہ سچی رائے نہیں کہلاوے گی۔ بلکہ تعصب اور جہل مرکب اُس کا مناسب نام ہوگا۔ مگر ایسا طریقہ حق اور سچ بات قبول کرنے کا ایک ذی عقل مخلوق کیلئے جیسا کہ انسان ہے شایاں نہیں۔ اور نہ یہ طریقہ راستی و حق کے پہچاننے کا ہے۔ بلکہ جو حق بات اِس طرح پر قبول کیجاتی ہے۔ وہ ایک خیال فاسد اور باطل ہے۔ اور جن باتوں کو حق فرض کر لیا ہے۔ اُن کا اتفاقیہ قبول کر لینا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۱)

(۸۶) نہایت سچ اور بالکل سچ تو یہ بات ہے۔ کہ جس شخص نے جو رائے یا مذہب اختیار کیا ہے۔ وہی شخص اُس کا جوابدہ ہے۔ اُس رائے کے موجد یا اُس مذہب کے پیشوا اور معلم اور مجتہد کچھ اسکے ذمہ وار نہیں ہیں۔ (ایضاً)

(۸۷) مباحثہ اور آزادیٔ رائے کی عدم موجودگی میں صرف مسئلہ یا رائیوں کی وجوہات ہی کو لوگ نہیں بھول جاتے۔ بلکہ اکثر اُس مسئلہ یا رائے کے معنی اور مقصود کو بھی بھول جاتے ہیں چنانچہ جن لفظوں میں وہ مسئلہ یا رائے بیان کی گئی ہے اُن سے کسی رائے یا خیال کا قائم کرنا تک موقوف ہو جاتا ہے۔ یا جو جو باتیں اُن لفظوں سے ابتدا میں مراد رکھی گئی تھیں۔ اُن میں سے بہت تھوڑی ہی معلوم رہ جاتی اور بعوض اسکے کہ اِس مسئلہ یا رائے کا اعتقاد ہر دم تر و تازہ اور زندہ یعنی موثر رہے۔ اُسکے صرف چند ادھورے کلمے حافظہ کی بدولت باقی رہ جاتے ہیں۔ اور اگر اُس کی مراد اور معنی بھی کچھ باقی رہتے ہیں۔ تو صرف اُنکا پوست ہی پوست باقی رہتا ہے اور مغز و اصلیت نابود ہو جاتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۲)

(۸۸) سچ بات پر سخت سے سخت نزاع کا ہونا کچھ بُرائی یا نقصان کی بات نہیں بلکہ اُس کا انسداد بہت بڑے نقصان کی بات ہے۔ جبکہ لوگ طرفین کے دلائل سننے پر مجبور رہتے ہیں۔ تو ہمیشہ انصاف کی امید ہوتی ہے مگر جبکہ وہ صرف یکطرفہ بات سُنتے

گورنمنٹ اِن باتوں کو بھول گئی - بلاشبہ تمام رعایاءِ ہندوستان اِس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے اُنکو نہایت بیقدر اور بے وقر کر دیا ہے - ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی کہ ایک چھوٹے یوروپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک کے سامنے - یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے - (ایضاً - صفحہ ۴۹)

(۴۳) رایوں کا بند رہنا خواہ بسبب کسی مذہبی خوف کے اور خواہ بسبب اندیشہ برادری و قوم کے اور خواہ بدنامی کے ڈر سے اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے نہایت ہی بُری چیز ہے اگر رائے اس قسم کی کوئی چیز ہوتی جس کی قدر و قیمت صرف اُس رائے والے کی ذات ہی سے متعلق اور اُسی میں محصور رہتی - تو رایوں کے بند رہنے سے ایک خاص شخص کا یا معدودے چند کا نقصان متصور ہوتا - مگر رایوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے - اور کل انسانوں کو نقصان پہنچتا ہے - اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو - بلکہ اُن کو بھی جو آئندہ پیدا ہونگے - (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲ - صفحہ ۳۳)

(۴۴) ہر ایک شخص کو گو اُسکی رائے کیسی ہی زبردست اور مضبوط ہو - اور وہ کیسی ہی مشکل اور نارضامندی سے اپنی رائے کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرے - یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر اُس رائے پر بخوبی تمام اور نہایت بیباکی سے بے دھڑک مباحثہ نہیں ہو سکتا - تو وہ ایک مُردہ اور مردار رائے قرار دی جاویگی - نہ ایک زندہ اور سچی حقیقت اور وہ کبھی ایسی حق اور سچی بات قرار نہیں پا سکتی جس کا اثر ہمیشہ لوگوں کی طبیعتوں پر رہے - (ایضاً - صفحہ ۴۰)

(۴۵) یہ بات کہ سچی اور درست رائے بے مباحثہ و دلیل کے بھی طبیعتوں میں بیٹھ جاتی ہے اور گھر کر لیتی ہے - ایک خوش آیند مگر غلط آواز ہے - دنیا کو دیکھو - کہ گروہ کے گروہ ایک دوسرے کی متناقض رائے پر جمے ہوئے ہیں - اور وہ متناقض رائیں اُن کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں . . . . پھر کیا وہ دونوں متناقض رائیں سچی اور صحیح ہیں - ہاں اس میں کچھ شک نہیں - کہ بہت سی

کہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ حالانکہ ہماری گورنمنٹ کو ہندوستان کی رعایا کیساتھ
ایسا ہونا چاہئے۔ جیسے کہ ابری کا پتھر۔ کہ باوجود دو رنگ کے ایک ہوتا ہے۔ سفید رنگ
میں سیاہ خال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اور سیاہی میں سفیدی عجب بہار دکھاتی ہے (ایضاً)
(۸۱) ہم نا انصافی کی بات نہیں کہتے۔ ہماری گورنمنٹ کو بلاشبہ عیسائیوں کیساتھ ایک
خاص محبت و دینداری رکھنی چاہئے۔ مگر ہم اپنی گورنمنٹ سے رعایائے ہندوستان پر وہ
برادرانہ محبت اور برادرانہ محبت پر وہ الفت چاہتے ہیں جسکی نصیحت پطرس[۱] مقدس نے
کی ہے۔ اب غور کرو کہ ہمارے حکام اور ہندوستانیوں کا خون ایک نہ تھا۔ مذہب ایک
نہ تھا۔ رسم و رواج ایک نہ تھا۔ دلی رضامندی رعایا کو نہ تھی۔ آپس میں محبت اور
اتحاد نہ تھا۔ پھر کس بات پر ہمارے حکام ہندوستان سے وفاداری کی توقع رکھتے تھے۔ (ایضاً صفحہ ۱۸)
(۸۲) اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ رعایا کو باعزت رکھنا اور اُنکی تالیف
کرنی یعنی اُن کے دلوں کو ہاتھ میں رکھنا بہت بڑا سبب ہے پائداری گورنمنٹ کا
تھوڑا ملے اور آدمی کی عزت ہو۔ تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتا ہے۔ بہ نسبت اِسکے کہ بہت
ملے اور تھوڑی عزت ہو۔ بےعزتی کرنی کسی کی ایسی بد چیز ہے۔ کہ آدمی کے دل کو دُکھاتی
ہے۔ یہی چیز ہے۔ کہ بغیر ظاہری نقصان پہنچائے عداوت کرتی ہے۔ اور اُس کا ایسا گہرا
زخم ہوتا ہے۔ کہ کبھی نہیں بھرتا۔ شعر

جراحات السنان لہا التیام
ولا یلتام ما جرح اللسان

تالیف کی خاصیت اِسکے برخلاف ہے۔ یہ وہ چیز ہے۔ کہ اِس سے دشمن دوست ہوتا ہے
اور دوستوں کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ بیگانہ یگانہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے کہ جس سے وحشی
جنگل کے جانور چرند پرند تابعدار ہوتے ہیں۔ پھر اگر رعایا کے ساتھ ہو۔ تو وہ کس قدر
مطیع و فرمانبردار ہونگے۔ ابتدائی عملداری میں یہ چیز تھی۔ کہ جس نے سب کے دلونکو
ہماری گورنمنٹ کی طرف کھینچ لیا تھا۔ ایک دلی اطاعت پیدا کر دی تھی۔ بیشک ہماری

---

[۱] پطرس خط ۲ باب ا ورس ۷۔

اور بہت اچھے اچھے نتیجے دیتی ہے۔ اور بہت سی برائیوں کو روکتی ہے۔ آجتک ہماری گورنمنٹ نے یہ محبت ہندوستان کی رعایا کے ساتھ پیدا نہیں کی۔ (ایضاً)

(۷۹) یہ بھی ایک عام قاعدہ محبت کا جبلت انسانی بلکہ حیوانی میں بھی قدرتی پیدا کیا گیا ہے کہ اعلیٰ کی طرف سے ادنےٰ کی طرف محبت چلتی ہے۔ باپ کی محبت اپنے بیٹے کی طرف پہلے اُس سے شروع ہوتی ہے۔ کہ بیٹے کو باپ سے۔ اسی طرح مرد کی محبت اپنی عورت کیطرف عورت کی محبت سے جو مرد کی طرف ہے مقدم ہے۔ اِسی بناء پر یہ بات ہے۔ کہ ادنےٰ جو اعلیٰ سے محبت شروع کرے۔ وہ خوشامد گنی جاتی ہے۔ نہ محبت۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہماری گورنمنٹ کو اول چاہئے تھا۔ کہ رعایا کیساتھ محبت و اتحاد کرنے میں تقدم کرتی۔ پھر محبت کا یہ قاعدہ جو ہزارہا تجربہ سے حاصل ہوا ہے۔ کہ خواہ نخواہ محبت دوسرے کے دل میں اثر کرتی ہے اور اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔ رعایا کے دل میں اثر کرتی اور رعایا اِس سے زیادہ ہماری گورنمنٹ کی محب بلکہ فریفتہ ہوجاتی۔ شعر

عشق آں خانہ ماں خرابی ہست
کہ ترا آورد بخانۂ ما

مگر افسوس کہ ہماری گورنمنٹ نے ایسا نہیں کیا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۷)

(۸۰) محبت ایک دل کی چیز ہے۔ جو کہنے سے اور بنانے سے نہیں بنتی۔ ظاہر میں بھی اگرچہ اُس کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور یہ سچ ہے۔ کہ نہ وہ بیان ہو سکتی ہے۔ اور نہ نشان دی جاسکتی ہے۔ مگر دل اُس کو خوب جانتا ہے بلکہ اُس کے ہاتھ میں ایک ایسی سچی ترازو ہے۔ کہ وہی ہتی کو بھی پہچانتا ہے

دل را از دل رہیست دریں گنبد سپہر
از سوئے کینہ کینہ و از سوئے مہر مہر

ہماری گورنمنٹ نے اپنے آپکو آجتک ہندوستانیوں سے ایسا الگ اور ان میل رکھا ہے جیسے آگ اور سوکھی گھانس۔ ہماری گورنمنٹ اور ہندوستانی پتھر کے دو ٹکڑے ہیں۔ سفید اور کالے۔ کہ الگ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اور پھر اُن دونوں میں ایک فاصلہ ہے

اُن سے کے برخلاف کرنا صریح انسانی خاصیئت کے برخلاف کرنا اور سب کو رنجیدہ رکھنا ہے کیا ہم بھول جائیں گے۔ بنگالے کی اُس بے انتظامی کی حالت کو جو ۱۷۶۵ء میں بروقت تفویض ہونے دیوانی بنگلہ کمپنی انگریز بہادر اسی ناواقفیت کے سبب ہوئی تھی۔ باوصفیکہ جان کلارک۔ مارشمن صاحب کی تاریخ اُسے یاد دلا رہی ہے۔ اور کیا یاد نہ رہیگی ہم کو وہ خوبی جو بنگالہ میں لارڈ ہیٹنگز صاحب بہادر کی زباندانی اور ملکی راہ و رسم کی واقفیت سے حاصل ہوئی تھی۔

(حیات جاوید ضمیمہ نمبر ۴۔ صفحہ ۴۴)

(۷۷) آپس کی محبت اور ہمسایہ کی دوستی سے گورنمنٹ اور رعایا کی محبت بہت بڑھ کر ہے۔ دوست کو ایک شخص سے دوستی کرنی پڑتی ہے۔ اور گورنمنٹ کو اپنی تمام رعایا سے محب اور محبوب صرف دو شخص ہوتے ہیں۔ اور دلی ارتباط سے ایک گنے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کو تمام رعایا سے ایسا ارتباط پیدا کرنا پڑتا ہے۔ کہ رعیت اور گورنمنٹ سب مل کر ایک تن ہو جائیں۔

(ایضاً صفحہ ۴۶)

(۷۸) دو غیر ملک اور مختلف مذہب کے آدمیوں میں دلی اتحاد ہوتا ہے۔ اُس صورت میں کہ وہ اتحاد کرنا چاہیں۔ اور یہ بھی دیکھتے ہیں۔ کہ دو ہم قوم اور ہم مذہب اور ہم وطن آدمیوں میں کمال دشمنی اور عداوت ہوتی ہے۔ اِس سے ثابت ہے۔ کہ محبت و اتحاد اور دوستی ہونے کو اتحاد مذہب اور ہم قوم ہونا ضرور نہیں۔ کیا پال مقدس[1] کی یہ نصیحت حکمت آمیز نہیں ہے۔ کہ جیسے ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔ ویسا ہی خداوند تمہاری محبت آپس میں دوسروں کیساتھ بڑھنے اور زیادہ ہونے دیوے جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ نہ صرف اپنے پڑوسیوں اور ہمقوموں سے بلکہ سب سے یہاں تک کہ دشمنوں سے بھی محبت ہو اور وہ محبت اور مہربانی بڑھتی جائے اور کیا مسیح مقدس کا یہ قول دل کو تسلی دینے والا نہیں۔ کہ[2] جو کچھ تم چاہتے ہو۔ کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں۔ ویسا ہی تم بھی اُن سے کرو۔ کیونکہ توریت اور نبیوں کی کتاب کا خلاصہ یہی ہے مراد مسیح مقدس کی اِس نصیحت سے محبت ہے غرضیکہ کوئی عقلمند اِس سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ محبت اور اتحاد بہت عمدہ چیز ہے

---

[1] پال کا خط ا۔ باب ۳۔ ورس ۱۲۔ [2] متی باب ۷، ورس ۱۲۔

ہم اپنا یقین ظاہر کرتے ہیں۔ کہ الہ آباد یونیورسٹی۔ پنجاب یونیورسٹی کی بہن نہیں ہونے کی وہ انگلش ہائی ایجوکیشن کے لئے بمنزلہ ایک مادرِ مہربان کے ہوگی۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے۔ کہ یہ ہمارا خیال غلط ہے۔ تو یہ سوال پیش آتا ہے۔ کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے۔ استقلال۔ استقلال۔ استقلال۔ ہمت۔ ہمت۔ ہمت۔ کوشش۔ کوشش۔ کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اگر ہم میں سلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے۔ تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے۔ کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے۔ مگر لوگوں کی رائیوں پر نہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۲)

(۷۶) سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ کہ واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومتِ ملک میں واجبات سے ہے۔ حکام کو بھلائی یا برائی تدبیر کی صرف لوگوں سے معلوم ہوتی ہے پیشتر اس سے کہ خرابیاں اُس درجہ کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہو۔ شعر

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اور یہ بات نہیں حاصل ہوتی۔ جب تک کہ مداخلت رعایا کی حکومتِ ملک میں نہو علی الخصوص ہماری گورنمنٹ کو جو غیر ملک کی رہنے والی تھی۔ اور مذہب اور رواج اور راہ و رسم اور طبیعت اور عادت بھی اِس ملک سے مختلف رکھتی تھی۔ اِس بات پر خیال رکھنا واجبات سے تھا گورنمنٹ کا انتظام اور اُس کی خوبی اور اسلوبی اور پائداری ملکی اطوار اور عادات کی واقفیت اور پھر اُسکی رعایت پر موقوف ہے۔ کیونکہ اگلی تاریخوں کے دیکھنے سے جو درحقیقت ایک روزنامچہ ہے عادات اور خیالات اور اطوار مختلفہ نوع انسان کا معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ اُن کی عادتیں اور خیالات اور اطوار موافق کسی عقلی قاعدے کے حاصل نہیں ہوتی ہیں بلکہ ہر ایک ملک اور قوم میں بحسبِ اتفاق ہوگئیں ہیں پس قواعد گورنمنٹ اُن اوضاع و اطوار پر موقوف ہیں نہ یہ کہ وہ اوضاع و اطوار اور عادات قواعد گورنمنٹ پر۔ اور اسی بات میں گورنمنٹ کی پائداری اور قیام ہے کیونکہ جبتک وہ عادتیں اور اخلاق رعایا کے دل میں مستحکم اور بمنزلہ خاصیت انسانی کے نہ ہوگئے ہوں اُسوقت تک

ناکام ہوجائے گی۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۰)

(۴) بنارس کالج نے سنسکرت کی زبان کی ترقی پر بہت توجہ کی۔ مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں اُن پنڈتوں کے برابر نہیں بنا سکا۔ جو دھوتی باندھے۔ کمرے پہنے منکنکا اور شیوالہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی مقدس زبان سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ مگر اُن کی تحصیل سے ملک کو بجز اِسکے کہ بنارس میں دس پانچ منگنا پنڈت اور زیادہ ہوگئے کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشاں کے طالب علموں کو جو کچھ تعلیم دی ہو۔ ہم کو اُس کا حال معلوم نہیں۔ مگر آجتک (ہندوستان میں) اُس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں اُن لوگوں کی برابر نہیں بنایا۔ جنہوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھکر اور درود و فاتحہ کی روٹی پر گذران کر کے عربی و فارسی کو تحصیل کیا۔ اور اعلیٰ درجہ کا تبحر اُن میں پیدا کیا۔ مگر اُس کا نتیجہ بجز اِسکے کہ مُردوں کی روٹیاں کھانے والے اور زیادہ ہوگئے۔ ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟ اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہوجائے اور ہم کو علوم مشرقی میں ویسی ہی تعلیم دے (گو ویسی تعلیم بھی ممکن نہیں) تو بجز اِس کے کہ چند بھکاری اور چند فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملک میں زیادہ ہوجائیں۔ اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہم کو صاف صاف بتاؤ۔ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو . . . . . پروفیشنسی اور ہائی پروفیشنسی کے خطاب مرحمت فرمائے ہیں۔ وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ اور اُن سے ملک کو۔ قوم کو۔ اُس کی دولت کو اُس کی حکومت کو۔ اُس کی تجارت کو۔ اُس کے اخلاق کو۔ اُس کی روشنضمیری کو اور اُس کی وسعتِ خیالات کو کیا فائدہ پہنچا یا آئندہ پہنچ سکتا ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے۔ کہ اس تعلیم سے مقصد ہی یہ ہے کہ ایسے نہ ہونے پائیں۔ تو سب کچھ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ (ایضاً)

(۵) علوم مشرقی کی ترقی کا دھوکہ انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹاتا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کولھو کے بیل کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی سرکل میں کولھو کے گرد پھرائے جاتا ہے۔ اُسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا بیشک ایک مہذب گورنمنٹ کا کام ہے۔ . . . . .

میں کچھ انصاف نہیں ہے۔ ہم کو بالغ العلوم اور مالک العلوم کے خطاب دینا اور پھر نابالغ کے درجہ پر رکھنا ہم کبھی پسند نہیں کر سکتے۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۸)

(۷۲) ہمارے لئے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے۔ کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے۔ یوروپین لٹریچر اور یوروپین سائنس میں اعلےٰ درجہ کی ترقی کریں۔ جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہو سکتے ہیں۔ حاصل کریں۔ جب اُس سے بھی زیادہ ہم میں ہمت ہو اکسفورڈ و کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں۔ اپنے تئیں مہذب و تعلیم یافتہ جنٹلمین ہیں اُس کے اصلی و حقیقی معنوں میں بنائیں۔ اور جو فیض تعلیم و تربیت و تہذیب ہم نے اُن مہذب ملکوں میں حاصل کیا ہو۔ اُسکو اپنے ہموطنوں اور ہمقوموں میں پھیلائیں۔ بیشک ہم کو ایسا کرنے میں بہت مشکلات ہیں۔ اِدھر ہم کو اپنی قوم کی جہالت و تعصب سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور اُدھر اپنی فتحمند قوم کے اُن تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے۔ جو ہماری سوشل اور پولٹیکل حالت کی ترقی اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں۔ ہماری انگلش لائف۔ انگلش تمدن۔ جنٹلمین کے سے اخلاق۔ یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں۔ اور چشم خشم آلود سے ہم کو دیکھتے ہیں۔ جیسے کوئی نہایت نیکدل بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہم کو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہئے۔ اور جو تکالیف و مشکلات ہم کو پیش آئیں۔ نہایت تحمل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں۔ مگر ہم اس بات کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے۔ کہ گریٹ ریفارمر (زمانہ) اِن باتوں کو ضرور ہونے دیگا۔ اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی و خفگی اُس کو روک نہیں سکے گی۔ لیکن بیشک یہ تنگدلی کے خیالات ناراضی کو ترقی دینے والے اور فاتح و مفتوح میں ہمدردی و محبت کو توڑنے والے ہیں۔ (ایضاً)

(۷۳) ہماری عین خوشی ہے کہ ملک کو فائدہ پہنچے۔ اور ہماری رائے غلط ثابت ہو۔ اور اگر وہ فی الحقیقۃ ملک کو فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے۔ تو اُسکو ہونے دو۔ اُس سے مخالفت کرنیکی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ خود اُس میں ناکامی کا بیج ہے۔ اور وہ آپ ہی

وہی لوگ برسر عرصہ اور حکومت میں شریک ہوئے۔ جنہوں نے اُن کے علوم۔ اُنکی زبان اُن کے سے خیالات۔ اُن کا سا تمدن۔ اُن کا سا لب ولہجہ اور اُن کی سی روشنی اختیار کی ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم ودیسی زبان اور دیسی علوم کو ترقی دیکر عزت ودولت وحشمت وحکومت حاصل کرینگے۔ بعینہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی امریکہ کے اصل باشندوں کو خیال دلاوے۔ کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں ترقی کرکے اپنی حکمران قوم میں عزت ودولت وحشمت وحکومت حاصل کروگے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۱۵)

(۷۰) قومی ترقی اور حکومت دونوں ماجائی بہنیں ہیں۔ پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے۔ تو اُس کی ترقی صرف اِس بات پر منحصر ہے۔ کہ وہ اپنی فتح مند قوم کے علوم وزبان حاصل کرنے سے اپنے فتحمندوں کیساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں اُن فتحمندوں نے قابلیت حاصل کی ہے۔ سوشل عادات اور علمی وعملی وملکی خیالات اِس قسم کے پیدا کرے۔ جو فاتح ومفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح ومفتوح میں اِس قسم کی مناسبت پیدا نہو۔ اُس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے۔ اُسی مناسبت کے نہ ہونیسے آجتک ہندوستان میں فاتح ومفتوح کے باہم دوستانہ برتاؤ نہیں ہے۔ خوشامد کی باتیں جو کوئی چاہے۔ سو کہدے اور پولیٹیکل طریقہ میں جو کچھ بیان کرنا ہو کیا جائے۔ مگر ہندوستانیوں کا حال اپنی فتحمند قوم کے ساتھ غلامی کی حالت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہم اس کا الزام اپنی فتحمند قوم کے ذمہ نہیں دھرتے۔ بلکہ خود اپنی قوم کے ذمہ ڈالتے ہیں۔ کہ اُس نے خود اپنے تئیں اِس لائق نہیں بنایا۔ کہ ہماری فتحمند قوم ہم سے دوستانہ برتاؤ کرسکے۔ (ایضاً)

(۷۱) ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کردیا ہے اور اُنہوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بیجا اور ناواجب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہے۔ مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں۔ اور گورنمنٹ کو بھی یقین دلانا چاہتے ہیں۔ کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چین جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدردان ہیں۔ شاید کوئی دوسرا ہوگا۔ پس نکتہ چینی کے اندیشہ سے ہماری تعلیم کو برباد کرنا ہمارے حق

(۷۷) ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں۔ کہ ہم کو مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کیساتھ نیکی کرنا نہیں ہے۔ بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ مکالے کو دعا دیتے ہیں۔ کہ خدا اُس کو بہشت نصیب کرے۔ کہ اُس نے اِس دھوکہ کی ٹٹی کو اُٹھا دیا تھا کیا وہ ٹٹی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی ہے؟ ایڈریس کیساتھ بڑے بڑے ہندوستانی سرداروں کا ہونا اور بہت بڑی فیاضی سے بڑے بڑے چندوں کا دیدینا مثل اُس فیاضی کے ہے۔ جو ہمیشہ وہ اصلی مقصد سے ناواقف رہکر دیگر اسباب سے کیا کرتے ہیں۔ اُن کی شان وشوکت ایسے امر کی۔ جو فی الحقیقت کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ وقعت نہیں بڑھا سکتی۔ چند ناعاقبت اندیش ہندوستانی شائد اِن باتوں سے خوش ہوتے ہونگے۔ اور گورنمنٹ کا احسان مانتے ہونگے۔ مگر دور اندیش آدمی اِن باتوں سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور نہایت افسوس و مایوسی سے گورنمنٹ کی اور اُن یورپین اعلیٰ درجہ کے حکام کی کارروائی کو جو اِس میں شریک ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۳)

(۷۸) ہم نہایت سچائی اور گورنمنٹ کی دلی خیرخواہی سے بتانا چاہتے ہیں۔ کہ سمجھدار اور دوراندیش ہندوستانی اِن تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ نہایت بدخیال اُن کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ چند سال گذرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا) کہ اُن کو کامل یقین تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں ہے۔ اور وہ ہم کو اِس قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کی اُس کو ضرورت ہے۔ وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے۔ کہ اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اُس کو انتظامِ ملک اور انتظام دفتر کے لئے چند ایسی پتلیاں درکار ہیں۔ جو انگریزی لکھ سکتی ہوں۔ اگر سمجھ نہ سکتی ہوں۔ جیسے کہ مانچسٹر میں سوت کاتنے کی پتلیوں کی ضرورت ہے۔ جو کچھ کہ وہ (یعنی گورنمنٹ) ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی۔ کوئی اُس کا شکرگذار نہ تھا۔ اسلئے کہ اُس کو خودغرضی پہ محمول کیا جاتا تھا نہ رعایا پروری پر۔ (ایضاً)

(۷۹) جب غیرقوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کرلیا۔ تو یہاں کے باشندوں میں سے

اب باقی نہیں رہا۔ اور جہاں مذہبی معاملات میں تفرقہ اور اختلافات تحمل کی ترقی کے سبب سے کم ہو گئے ہیں۔ وہاں ایسے معاملہ میں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آتیں۔ قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں اور تعلیم کی ترقی سے حقیقت اختلافات جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں۔ بالکل ناچیز ہو گئے ہیں۔ عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطالب کی حمایت کرنے کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دیتے ہیں کچھ عذر نہیں ہوتا۔ اور درحقیقت سوشل اور پولیٹیکل مقاصد کیواسطے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے۔ (ایضاً)

(۷۵) انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی۔ مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے۔ ہماری خواہش ہے۔ کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف زمانہ دراز تک ہی نہیں۔ بلکہ ازل ہونی چاہئے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اپنے ملک کیلئے۔ ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا اُن کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اپنے ملک کی بھلائی و بہتری کیلئے ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ ہم میں اور انہیں سمپھتی نہو۔ سمپھتی سے میری مراد پولیٹیکل سمپھتی نہیں ہے۔ پولیٹیکل سمپھتی تانبے کے برتن پر چاندی کے ملمع سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ اُس کا اثر دونو (فریق) کے دلوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ ایک فریق جانتا ہے۔ کہ وہ تانبے کا برتن ہے۔ دوسرا فریق سمجھتا ہے۔ کہ وہ جھوٹے ملمع کی قلعی ہے۔ سمپھتی سے میری مراد برادرانہ و دوستانہ سمپھتی ہے۔ (حیات جاوید حصہ ۲ صفحہ ۱۵)

(۷۶) ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہئے۔ کہ جو کچھ کیا جاتا اور کہا جاتا ہے۔ کہ ہماری اور ہمارے ملک کی بہبودی اور ترقی کیلئے ہے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ صرف دھوکہ ہو۔ ہم کو اسوقت پچھلے زمانہ کے قصے اور کہانیوں کو یاد دلانا۔ اور کہنا۔ کہ ایشیا میں اور ایشیاء کی سلطنت کے زمانہ میں علوم و فنون کیا تھے۔ اور اُن کے وقت میں اُن کو کیسی ترقی اور سرسبزی تھی محض بے فائدہ ہے۔ ہم کو اپنے زمانہ کے حالات پر جو گورنمنٹ انگلشیہ کی حکومت کا زمانہ ہے غور کرنا۔ اور اُس کو ہندوستان ہی کی حدود میں محدود رکھنا ہمارے لئے زیادہ تر مفید اور بکار آمد ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۱۲)

کا اندازہ کرسکیں۔ کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولتمند۔ طاقتور اور دانا ہیں۔ اور اُن مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کیواسطے سیکھیں۔ جو اُس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اُس کے شہروں کی صفائی اور اُس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۴۹)

(۴۳) میں اس بات کے خیال کرنے سے خوش ہوں۔ کہ میں اس قدر عرصہ تک زندہ رہا۔ کہ میں نے اُس دن کا آغاز دیکھ لیا۔ جبکہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سلف ہیلپ اور سلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے۔ جنہوں نے انگلستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹیٹیوشن پیدا کئے ہیں۔ اور اُسکو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۲)

(۴۴) انگلستان سے ریپریزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں اُن سوشل اور پولیٹکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ . . . . . . ہندوستان فی نفسہ ایک برّاعظم ہے۔ اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے ابتک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ ذات کا قاعدہ بہت شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ ممکن ہے۔ کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے باشندے ہوں۔ اور ایک گروہ دانشمند اور تجارت پیشہ ہو تو دوسرا گروہ ذی علم اور غریب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو۔ اور روشنضمیری جس درجہ تک وہ گروہ پہنچ گیا ہو۔ وہ درجہ باقی باشندوں کی وجہ سے بہت اعلیٰ ہو ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں اُن کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پرواہ نہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہو۔ کہ ہندوستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی مشکلیں اور پولیٹکل خطرات پیدا ہوں گے۔ ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے۔ جہاں قومی امتیاز

(۶۹) بادشاہوں میں سے جو ظالم کہلاتے ہیں۔ وہ ایک کے سوا۔ جو درحقیقت مجنون تھے کسی بادشاہ نے ظلم کے ارادہ سے ظلم نہیں کیا۔ بلکہ صرف اِس خیال سے کیا۔ کہ ویسا کئے بغیر اُن کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ ممکن ہے۔ کہ اُن کے اِس خیال اور اندازہ میں غلطی ہو۔ (ایضاً)

(۷۰) جس طرح ہم اپنے محسنوں کا احسان نہیں بھول سکتے۔ اُسی طرح نامہربان افسروں کی شکایت ہمارے دل سے فراموش نہیں ہو سکتی۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۸۲)

(۷۱) ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بڑی وقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اُسکے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ آف ڈائرکٹر تک پہنچتے تھے۔ اور پارلیمنٹ سے بہت ہی کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور اب ہندوستان کے امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اِس غرض کیلئے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں۔ ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہئے۔ جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے اُنکو مطلع کریں۔ اور جس طرح اُن انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے۔ اُسی طرح ہم بھی اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں۔ اور اُسکے ذریعہ سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔ (حیات جاوید حصہ ا۔ صفحہ ۱۲۶)

(۷۲) یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے۔ کہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو۔ جس کی ملازمت کا فخر مجھکو حاصل ہے۔ بخوبی استحکام و پائداری بخشنے کے واسطے اِسکے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط و ضبط کو ترقی دی جائے۔ پس اِس مقصد کی تکمیل کیلئے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہئے۔ تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اُس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں۔ اور اسباب

سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اونٹ چراتے ہیں۔ جو پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اونٹنیوں کا دودھ پیتے ہیں۔ اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔ ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے۔ وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے۔ اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہے۔ بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے ایک پریزیڈنٹ جسکو لوگ منتخب کریں۔ اُسکو اسلام پسند کرتا ہے اور اِس بات کو پسند نہیں کرتا۔ کہ دولت ایک جگہ اکٹھی ہے۔ اِسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا۔ کہ بعد فوت ہوجانے کسی شخص کے اُسکی جائداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہوجاوے۔ کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائداد کیوں نہو۔ وہ بعد دو نسلوں کے یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہوجاویگی پس میں دونوں طرح کیا بلحاظ مذہب اور کیا بلحاظ خون ریڈیکل ہوں (حیات جاوید حصہ ۲ صفحہ ۳۲۴)

(۶۷) حقیقت میں اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیاں ہیں۔ جو ہزاروں برائیوں کیساتھ اگلے زمانہ کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں۔ اور جن سے اُن برائیوں کا علاج ہوتا تھا۔ ع

چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

اب اُن کا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک گورنمنٹ ہو۔ جیسے کہ قدیم تھی زیادہ تر مفید ہوگی۔ وہ نہایت غلطی پر ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۴۷)

(۶۸) سلطنت شخصی ہو یا جمہوری۔ ایک امر میں دونوں کا اصول ایڈمنسٹریشن متحد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ اپنی گورنمنٹ کو جس طرح ہوسکے قائم اور مضبوط رکھنا سب سے مقدم اور سب سے بڑا انصاف ہے۔ اور اسکے بعد رعایا کے واجبی حقوق کی حفاظت کرنا ہے پہلے امر کی متعلق ایک مہذب سلطنت یا سلطنت جمہوری بھی وہی کرتی ہے۔ جو ایک نامہذب سلطنت یا شخصی سلطنت کرتی ہے۔ کوئی نظیر دنیا میں ایسی نہیں ہے۔ کہ ایسے وقت میں ایک مہذب یا جمہوری سلطنت نے وہ نہ کیا ہو۔ جو ایک نامہذب یا شخصی سلطنت نے کیا ہو۔ (ایضاً صفحہ ۳۴۳)

خوشنودیٔ حکام کا باعث ہوگا۔ خواہ وہ کام مسجد ہی کے بنانے کا ہو یا مدرسہ یا شفاخانہ یا مدرسۂ نسوان کے قائم کرنے کا یا اور کوئی۔ تو اُس وقت کس قدر فیاضی برتی جاتی ہے۔ اور بیدریغ چندہ دیا جاتا ہے۔ اور پھر اُس سے ثواب آخرت کی توقع رکھی جاتی ہے۔ العجب ثم العجب + (ایضاً۔ صفحہ ۴۰۹)

سیاسی (پولٹیکل)

(۶۵) ہم کو ایسی نیکی پر بھی جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک سمجھا ہے۔ مگر درحقیقت اُس کی نیکی مشتبہ ہے۔ زیادہ اصرار نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ اُن لوگوں کی رائوں کی بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہئے۔ جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اور جو عقلمند اور نیکدل ہیں۔ اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کہتے ہیں۔ اُسی طرح وہ بھی نیکدلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہئے۔ کہ اِن اختلاف کرنے والوں نے صرف آزادی رائے اور اُس دلی نیکی سے جس کے سرچشمہ کی سوت قدرت نے ہر ایک انسان کے دل میں کھولی ہے۔ اختلاف کیا ہے۔ یا کسی بیرونی دباؤ۔ پابندی رسم و رواج اور تعصب و تقلید نے اُن کے دل کو پھیرا ہے۔ کیونکہ اگر یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو۔ تو وہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے۔ (تہذیب الاخلاق۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۸۱)

(۶۶) میں مسلمان ہوں۔ ہندوستان کا باشندہ ہوں۔ اور عرب کی نسل سے ہوں اِنہیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں۔ اور مسلمان ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور قومی دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اِس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اِس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں۔ کوئی اور اُن پر حکومت کرے۔ اِس وقت تک اہلِ عرب آزاد ہیں۔ اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ سلطان ٹرکی کو سلطان نہیں کہتے۔ بلکہ اپنے ویران اور پتھریلے جزیرہ نما کا خادم

(۵۵) قومی بھلائی یا قومی بُرائی کا اثر تمام قوم کے لوگوں پر پہنچتا ہے۔ اور اِسی لئے جلب منفعت یا دفع مضرت میں سب لوگ متفق ہوتے ہیں۔ اور شخصی تنازعات کا اُس وقت کچھ اثر باقی نہیں رہتا۔ اِس زمانہ میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے۔ وہ یہی ہے کہ اُس میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیاً ہو گیا ہے۔ کسی کو بجز اپنی ذاتی منفعت کے قومی بھلائی اور قومی منفعت کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اگر کوئی کچھ کرتا بھی ہے۔ تو اُسکو پہلے اپنی غرض مدِ نظر ہوتی ہے۔ اور قومی بھلائی کے پردہ سے اُسکی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۷۲)

(۵۶) قومی کاموں میں صرف گورنمنٹ پر بوجھ ڈالنا۔ اور اُسی کے ہاتھ کو تکتے رہنا نہایت بُزدلی اور بے عزتی کا کام ہے۔ ہمارا فرض ہونا چاہئے۔ کہ ہم اپنے قومی کام کو خود اپنی مستعدی سے انجام دیں۔ اور گورنمنٹ سے صرف اُسکی امداد کے متوقع رہیں۔ اگر یہ ہوگا۔ تو قوم اور گورنمنٹ دونوں اپنا فرض ادا کریں گے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۷۵)

(۵۷) تم خدا کا گھر اینٹ مٹی سے بنانے پر رغبت رکھتے ہو۔ اور زندہ خانہ زندہ خدا کی زندگی کی کچھ پرواہ نہیں کرتے ہو۔ ہوشیار ہو خبردار ہو۔ جان لو۔ کوئی عبادت۔ کوئی خیرات کوئی خیر جاری۔ قومی ہمدردی سے بہتر نہیں ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۹۵)

(۵۸) میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں۔ جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان کو دیکھتا ہوں۔ تو میں اُس کے اُس حصہ کی جو نیلا نیلا سیاہ اور ڈراونا ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا۔ مگر اُن ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اُس میں چمک رہے ہیں۔ اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور جس کے سبب سے اُس تمام سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۴۱)

(۵۹) بچوں کو صرف تعلیم ہی دیدینا کافی نہیں ہے۔ اُن میں قومیت کی روح پھونکنی اُنکی تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ یہ روح اُن میں پڑ نہیں سکتی جبتک گروہ گروہ بچے ایک جگہ جمع کر کے تعلیم نہ دیئے جائیں اور اُن کے دل میں قومی کالج کے ہونے کے خیال کا اثر اور

خود اپنی ہمدردی اور اپنی عزت کی ترقی کرتے ہیں۔ اگر یہ میرا بیان درست ہو۔ تو اُس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ جو شخص اپنی عزت چاہتا ہے۔ اور یقین ہے۔ کہ ہر کوئی چاہتا ہوگا۔ اُس پر یہ فرض ہے۔ کہ قومی ہمدردی اور قومی عزت پر کوشش کرے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۹۸)

(۴۸) چند معدود مسلمان جو تجارت کرتے ہیں۔ اُنکی بڑی سے بڑی تجارت یہ ہے۔ کہ غیر ملک اور غیر قوم کے لوگ جو کلکتہ اور بمبئی میں مال لاتے ہیں۔ اُن کو نفع دیکر خریدتے ہیں۔ اور پھر اپنے ہی ملک میں اپنے بھائی بندوں کے ہاتھ نفع پر بیچتے ہیں پس اُن سے بعوض اسکے کہ قوم کو فائدہ پہنچے۔ اُلٹا نقصان پہنچتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۰۰)

(۴۹) سب سے ذلیل اور ناپسندیدہ ذریعہ حصول معاش کا نوکری ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۰۱)

(۵۰) قومی ترقی اور قومی عزت حاصل کرنے کے دو ذریعہ ہیں۔ اول امن وامان ملک میں۔ دوسرے تعلیم و تربیت قوم میں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۰۲)

(۵۱) کوئی تمغہ کوئی خطاب کوئی عزت انسان کیواسطے اپنی قوم کی قدردانی سے زیادہ فخر کا موجب نہیں ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۱)

(۵۲) جس قوم میں باپ دادا کے افتخار سیاً مسیاً ہو جاتے ہیں۔ یا بطور دیو پری کی کہانیوں کے باقی رہ جاتے ہیں۔ اُس قوم سے ترقی کی امید باقی نہیں رہتی۔ الحمدللہ ہماری قوم کی حالت اب ہی ایسی نہیں ہوئی۔ ہوسکتی ہے پر کچھ جان باقی ہے۔ اگر خدا مدد کرے۔ تو شاید صحت پا جاوے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۵۱)

(۵۳) کوئی بےعزتی۔ اور بےغیرتی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ کہ ہم اپنے سلف کے ایسے خلف ہوں۔ جن سے ہمارے اسلاف کی نام آوری کو بھی بٹہ لگے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۵۲)

(۵۴) بہت لوگ ہیں۔ جو ذاتی عزت کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ اور اپنی دانست میں اُس کو حاصل بھی کر لیتے ہیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں۔ کہ وہ اُسی قوم کے افراد میں سے ایک ہیں۔ جو سب کی نظروں میں ذلیل ہے۔ اور وہ ظاہری عزت جو اُنھوں نے پائی ہے پیتل کے برتن پر صرف ملمع کی سی چمک ہے جس کی خود ملمع کرنے والا یا عزت دینے والا کچھ قدر نہیں کرتا۔ (ایضاً)

کے لئے قافلہ کی راہ دیکھنا محض بے فائدہ اور سراپا غلطی ہے۔ جو شخص بہادر ہے۔ اور اپنی قوم کا سچا خیر خواہ اُس کو خود اِس بھاری بیڑی کو توڑ کر میدان میں آنا چاہئے۔ تاکہ لوگوں کو بھی اِس قید سے نکلنے کی ہمت اور جرأت ہو۔ (ایضاً۔ صفحہ ۹۴)

(۴۶) اے میرے دوستو! یہ زمانہ ایسا ہے۔ کہ ہر ایک کے دل میں تہذیب و شائستگی کی امنگ ہے۔ بہت سے لوگوں کو تم دیکھو گے۔ کہ ہزاروں رسموں کو فضول اور لغو سمجھتے ہیں۔ اور کچھ بھی اُس میں یقین نہیں رکھتے۔ پر کرتے ہیں۔ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں۔ جن کے بے نقص ہونے پر یقین کرتے ہیں۔ پر کرتے نہیں۔ ایسی باتوں سے کچھ قوم کی بھلائی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ میری سمجھ میں یہ بھی ایک قسم کی دغا بازی ہے۔ میری نصیحت تم سب کو یہ ہے۔ کہ کرو اُس کو جس پر تم کو دلی یقین ہو۔ اور مت کرو اُس کو جس پر تم کو دلی یقین نہیں۔ یہی اصلی سچائی ہے۔ اور یہی ایک بات ہے جس پر دونوں جہاں کی نیکی منحصر ہے۔ خدا تمہارے نیک کاموں میں تمہاری مدد کرے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۹۷)

(۴۷) ایسے دل بہت کم ہونگے۔ کہ جو دنیا میں عزت و آبرو کے خواہاں نہ ہوں۔ اور ایسے دل بھی بہت کم ہونگے۔ کہ جب اُن کو عزت و آبرو کا خیال آتا ہو۔ تو اُن کا دل اِس خیال کو اپنی ذات کی طرف نہ لیجاتا ہو۔ مگر جب اِس نہایت مرغوب معاملہ پر غور کیا جائے۔ تو شخصی عزت کی خواہش ایک بہت بڑی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جبتک قومی عزت حاصل نہو۔ اُسوقت تک شخصی عزت کا حاصل ہونا محالات سے ہے۔ اگر ایک کمینہ قوم کا شخص جس کی قوم کے تمام آدمی نہایت ذلت و خواری اور کمینہ پن سے اپنی اوقات بسر کرتے ہوں۔ جن سے اُس کا ہمیشہ میل جول اور اُنہیں کے ساتھ رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے۔ کسی سبب سے کوئی درجہ عزت کا حاصل کرے۔ تو بلاشبہ اُسکی بہت بڑی تعریف ہوگی۔ مگر دنیا کی آنکھ میں اُس کو کچھ عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تمام دنیا میں اُس کی قوم کو اُس ذلت و خواری اور کمینہ پن کی حالت میں دیکھکر اُس کو بھی اُسی قوم کا ایک خیال کرتی ہے۔ پس شخصی عزت کا حاصل کرنا بھی درحقیقت قومی عزت پر موقوف ہے۔ اور جب تک قومی ہمدردی نہ ہو۔ قومی عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس جو لوگ قومی ہمدردی اور قومی عزت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ درحقیقت میں

اپنا فخر دکھانے کی نظر سے۔ بلکہ نہایت عاجزی اور غریبی اور خاکساری اور دلی نیکی اور روحانی ہمدردی سے۔ تاکہ ہماری فانی دولت۔ ہماری قلب نما عزت۔ ہمارا اچھوتا ظاہری فخر اُسکے اثر کو لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جانے سے روک دے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۲)

(۴۳) انسان کا مختلف قوموں پر تقسیم ہونا بھی اُس کی شایستگی کا بڑا مانع ہے۔ اور ہر زمانہ میں جہالت اور کم ہمتی ہی اِس بات کا باعث ہوئی ہے۔ کہ انسان دوسرے انسان کا غلام بنے یا اُس کا اِس طرح مطیع رہے۔ حالانکہ شائستگی اُس وقت تک ہرگز حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ انسان کو اپنے خیالات ظاہر کرنے اور اُن کے موافق عمل درآمد کرنے میں آزادی حاصل نہو۔ (ایضاً صفحہ ۲۶)

(۴۴) قومی ترقی۔ قومی تعلیم و تربیت پر منحصر ہے۔ پس اگر ہم اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم و ہنر سکھانے پر کوشش کریں۔ مگر افسوس یہ ہے۔ کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ اِس زمانہ میں علم کیا چیز ہے۔ جس سے قومی ترقی ہوتی ہے۔ آجتک جو ہم نے جانا اور جو ہمارے بزرگوں نے جانا۔ علم کی حقیقت کو اِس قدر جانا۔ کہ ایک شئے عقلی ہے۔ جو خیال اور حافظہ میں رہتی ہے اور نفس کو اُس سے بہت مزا اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مگر اِس زمانہ میں اُسی کو اصلی علم کہتے ہیں جو دیکھنے اور برتنے اور تجربہ میں آوے۔ اور انسان کے لئے اُس کے تمام کاموں میں مفید ہو۔ (ایضاً صفحہ ۶۱)

(۴۵) جس شخص کے دل میں اصلاح و ترقی کا خیال ہو۔ اُس کو چاہئے۔ کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اِس رسم کو توڑنے یا اُسی میں اصلاح و ترقی کرنے سے اِس میں شک نہیں کہ تمام قوم اُس کو بُرا کہے گی اور نکو بنائیگی مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اُس کی پیروی کرنے لگیں گے۔ اور جس طرح کہ اولاً وہ ہدف تیر ملامت ہوا تھا۔ انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور معلم قوم شمار کیا جاویگا۔ جب تک کہ کوئی شخص تمام قوم سے اختلاف کرکے رسم کو نہ توڑے۔ وہ رسم موقوف ہی نہیں ہوسکتی۔ پس یہی ایک طریقہ اختلاف ہے جس سے قوم کی اصلاح و ترقی ہوسکتی ہے۔ اور ایسا کرنے والا ہی سچا خیر خواہ اپنی قوم کا متصور ہے۔

پس میں اپنے عزیز ہموطنوں سے کہتا ہوں۔ کہ چپکے چپکے اپنے فرقہ کے لوگوں میں بیٹھکر رسموں کو بُرا کہنا اور اُن کی اصلاح و درستی کے لئے ساتھیوں کو ڈھونڈھنا اور قید سے نکلنے

اور اخلاق کے ایسے معقول اور مضبوط اصولوں کو شائع کرنے میں بھی اتفاق کریں۔ جنکے سبب سے ایک ملک قوموں میں امتیاز حاصل کرتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۵)

(۴۰) ہندوستان باستثناء روس اور بالٹک کے شمالی حصہ کے یوروپ کے برابر ہے اور جس طرح کہ یوروپ میں متعدد قومیں آباد ہیں۔ اِسی طرح ہندوستان میں بھی متعدد قومیں بستی ہیں۔ اور جس طرح یوروپ کی قومیں باہم مشابہت رکھتی ہیں۔ اِسی طرح ہندوستان کی قومیں بھی باہم مشابہ ہیں۔ اگر کوئی پردیسی یوروپ میں جاوے تو اٹلی والوں اور انگلستان والوں میں کچھ تمیز نہ کرسکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی پردیسی ہندوستان میں آوے تو ہندوستان کی بھی مشابہ قوموں میں یکایک کچھ امتیاز نہ کرسکے گا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۷)

(۴۱) شائستگی سے میری مُراد اُن رسموں اور عادتوں سے نہیں ہے۔ جو بہ سبب ملکی حالات اور آب و ہوا کی تاثیر سے مختلف ملکوں کی قومیں مختلف طور پر برتاؤ میں لاتی ہیں۔ اور ایک قوم دوسری قوم کی رسم کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ ایک ہندوستانی ٹوپی اتار کر ننگے سر ہونیکی رسم کو حقیر سمجھتا ہوگا۔ ایک یوروپین جوتا اُتار کر ننگے پاؤں پھرنے کی رسم کو حقارت سے دیکھتا ہوگا کوئی ہاتھ سے کھانا کھانے والوں کو جنگلی جانوروں کی مانند جانتا ہوگا۔ کوئی کسی کو تیلیوں اور چمچوں سے کھاتے دیکھکر متعجب ہوتا ہوگا۔ مگر اِس قسم کی رسموں پر خیال کرنا۔ اور ایکدوسرے کو حقارت کی نظر سے دیکھنا یا اُس کے درپے ہونا شائستہ پن نہیں ہے۔ شائستگی سے مراد میری وہ خلقی اور علمی اور عمدہ باتیں ہیں۔ جو نیچر کے قواعد پر خیال کرنی نفسہ عمدہ ہیں۔ نہ کسی ملک یا کسی مذہب کی رعایت سے پس جبکہ ہم شائستگی کی ترقی کے درپے ہوں۔ یا کوئی قوم اپنی فیاضی سے ہم کو شائستہ تربیت یافتہ کرنیکے درپے ہو۔ تو ہم دونوں کو واجب ہے۔ کہ ہم اِس قسم کے تعصبات کو دل سے دور کرکے اور دلی نیکی سے بلا کسی حقارت اپنے غرور پندار کے ایکدوسرے کی نیکی اور ہمدردی میں شریک ہوں۔ اور اپنے فرض کو اپنے بھائی بندوں کی بھلائی چاہنے میں۔ ادا کریں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۴۱)

(۴۲) ہم کو اپنے تئیں ملکی فخر و امتیاز نصیب ہونے کیلئے یہی چاہئے کہ ہم عام علم اور عام تربیت پھیلانے پر کمال ہو کر کوشش کریں۔ مگر نہ کسی جھوٹے یا اوپرے دل سے اور نہ اپنی شان اور

ہماری بلا سے۔ اُن کا کیا رونا ہے جیتیوں کو روؤ۔ جو مُردوں سے بھی بدتر ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۵۲)

(۲۷) ہمارے بعض محب وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں۔ کبھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی اِن کو کسی سویلائزڈ یعنی مہذب و تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے تو اُس کو بہت طمطراق سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جب اُس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں۔ تو ہماری قوم کو کیوں بُرا کہا جاتا ہے۔ مگر اُن کو سمجھنا چاہئے۔ کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھُلی کو ٹٹولیں۔ تو اُس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہئے۔ دوسرے کی آنکھ میں پھُلی ہو یا نہ ہو۔ باایںہمہ وہ لوگ اِس بات میں ذرا انصافانہ بھی نظر نہیں کرتے۔ قوم کی محبت انصاف کو چھُپا دیتی ہے۔ جس قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں۔ اُسی وقت اِس عجیب بات کو بھول جاتے ہیں کہ اُس قوم میں خوبیاں کتنی ہیں۔ ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں۔ اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں اصلی محبت اور سچی خیرخواہی قوم کی یہی ہے۔ کہ اُس کے نقصانوں کو دیکھے۔ اور اُن کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں۔ اُن کا دل اپنی قوم کی حالت پر بہ نسبت اُن کے جو قوم کی طرفداری کرتے ہیں۔ اور اُس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں۔ زیادہ جلتا ہے۔ اور حقیقت میں وہی لوگ محب وطن اور محب قوم ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۵۱)

(۲۸) اے میرے بھائیو۔ ہمت کرو اور مستعد رہو اور اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لئے روپیہ کو عزیز مت رکھو۔ اور جہاں تک ہو سکے۔ دو۔ اور کوڑیوں کے بدلے بے بہا اَن اور عزت اور نیکنامی لو۔ نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے اور اپنے بھائی بندوں کی اولاد اور پشت در پشت کے لئے اور اُس کے بخیر انجام ہونے کے لئے خدا سے دعا مانگو۔ اور اُسی پر نظر رکھو۔ کہ وہی سب کام پورا کرنے والا ہے۔ (مجموعہ لکچرز۔ صفحہ ۲۳)

(۲۹) جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے عزت اور وقر اور اختیار عنایت کیا ہے۔ وہ صرف اپنے ہی فائدوں کی رعایت اور حفاظت میں متفق اور مجتمع نہ ہوں۔ بلکہ تعلیم اور نیک باتوں

آدمیوں کو کھلا کر کھاتا ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی ہے۔ جو تن پروری کو عبادت سمجھا جاوے اور اصلی فیاضی اور سخاوت اور ہمدردی کو عبادت نہ سمجھا جاوے۔ (ایضاً صفحہ ۱۶۲)

(۳۴) طوطے کی طرح اللہ اللہ جپنا اور یا ہو کبوتر کی مانند غوٹر غوں غوٹر غوں کرنا اللہ کی یاد نہیں ہے۔ بلکہ اُس نے جو چیزیں ہم کو مرحمت کی ہیں۔ اُن کو اُسی کے کام میں صرف کرنا خدا کی یاد ہے۔ عقل ہم کو خدا نے اِسلئے دی ہے۔ کہ اُس کی صنائع و بدائع پر غور کریں۔ اُس کی عجائب قدرت کو دیکھیں۔ اور اُس کے وجودِ ازلی و ابدی بے ضد و ند پر یقین کریں۔ آنکھ۔ ناک حس و حرکت اِسلئے بخشی ہے۔ کہ ہماری عقل کے مصاحب اور مددگار ہوں۔ نطق ہم کو اِسلئے دیا ہے۔ کہ ہم اوروں کو اپنے خیالات کا فائدہ پہنچا دیں۔ مال و متاع اِسلئے مہیا کیا ہے۔ کہ ہم خود بھی اُس سے فائدہ اٹھا دیں اور اوروں کو بھی فائدہ پہنچا دیں۔ یہ کیسا وحشیانہ طریقہ ہے۔ جس میں اپنی ذاتی غرض کے سواء کچھ مدِ نظر ہی نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۷۷)

(۳۵) ہم کو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ کوئی قوم وہ کیسی ہی عمدہ اور مہذب ہو۔ مگر جو بُرائیاں اُسمیں ہیں۔ وہ اُس کے وصف نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کے کمال کی کمی ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی نہیں چاہئے۔ اگر ایک خوبصورت آدمی کے منہ پر ایک مسّہ ہو۔ تو ہم کو خوبصورت بننے کے لئے ویسا ہی مسّہ اپنے منہ پر نہ بنانا چاہئے۔ کیونکہ وہ مسّہ اُس کی خوبصورتی نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی خوبصورتی کا نقصان ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو یہ خیال کرنا مناسب ہے کہ اگر یہ مسّہ بھی اُس کے منہ پر نہ ہوتا۔ تو کتنا اور خوبصورت ہوتا۔

ہم بلاشبہ اپنی قوم کو اپنے ہموطنوں کو سویلائزڈ قوم کی پیروی کی ترغیب کرتے ہیں۔ مگر اُنسے یہ خواہش رکھتے ہیں۔ کہ اُن میں جو خوبیاں ہیں۔ اور جن کے سبب وہ معزز اور قابل ادب سمجھی جاتی ہیں۔ اور سویلائزڈ شمار ہوتی ہیں۔ اُن کی پیروی کریں۔ نہ اُن باتوں کی جو اُن کے کمال میں نقص کا باعث ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۴۸۶)

(۳۶) جو بات سچ ہے۔ وہ آپس کی ہمدردی۔ قومی اعانت۔ قومی بھلائی ہے۔ جبکہ ہماری قوم کا دنیا میں یہ حال ہے۔ کہ ذلت و خواری۔ نکبت و جہالت میں مبتلا ہے۔ تو اگر کوئی دنیا کی حسرت میں مر کر جہنم میں گیا۔ تو ہماری جوتی سے۔ اور عبادت کر کے بہشت میں گیا تو

فیاض ہو۔ اور ہمارے سب کام کر دے۔ اِس کے یہ معنی ہیں۔ کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔

یہ ایسا مسئلہ ہے۔ کہ اگر اِس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے۔ اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے۔ اور اُسکے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں۔ جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لالہ اشرفی لال جوہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں۔ انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لایق گنے جاتے ہیں؟ (ایضاً صفحہ ۱۳۱)

(۲۱) بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط۔ جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے "وہ اپنی آپ مدد کرتا ہے" جس وقت لوگ اُس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاوینگے تو پھر خضر کو ڈھونڈھنا بھول جاویں گے۔ اَوْروں پر بھروسہ۔ اور اپنی مدد آپ۔ یہ دونوں اصول ایکدوسرے کے بالکل مخالف ہیں پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے۔ اور پہلا خود انسان کو۔ (ایضاً)

(۲۲) ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیز گاری اور بے لگاو ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے۔ اُس شخص کا اُسکے زمانہ میں اور آیندہ زمانہ میں اُسکے ملک اُسکی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اُسکی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے۔ اور آیندہ کی نسل کیلئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۳۲)

(۲۳) زہد و ریاضت جہاں تک کہ حدِ شرعی سے تجاوز نہ کرے۔ بلاشبہ نیکی و عبادت ہے۔ مگر عام فلاح پر کوشش کرنا اور ایسے امور پر کوشش کرنا جو اپنے ہم مذہبوں کی دینی اور دنیوی حال اور مال کی بھلائی و بہتری کے ہوں۔ اُس سے بہت زیادہ مفید ہیں۔ زہد و ریاضت ایک بخیل نیکی ہے۔ جو صرف اپنی ذات کیلئے کی جاتی ہے۔ اور اُس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو ایک کوٹھڑی میں بیٹھ کر کھانا کھاوے۔ اور صرف اپنا پیٹ بھرے۔ عام فلاح چاہنے والا جو اِس کام میں زہد و ریاضت کرتا ہے۔ اُسکی مثال حاتم کی سخاوت کی سی ہے۔ جو ہزاروں

قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزت ہو جاتی ہے۔ آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں۔ خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (یہ امر بدیہی اور لابدی ہے) وہ اُسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہموطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۷)

(۲۸) اے میرے عزیز ہموطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے۔ تو اُس کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو۔ کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو۔ تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا۔ بات چیت کا وضع و لباس کا۔ سیر سپاٹے کا۔ شغل اشغال کا تمہاری اولاد کے لئے ہے۔ اُس سے اُن کے شخصی چال چلن۔ اخلاق۔ عادت۔ نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے۔ حاشا و کلاّ۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۹)

(۲۹) جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اِس بات کی امید پر بیٹھے رہنا۔ کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اِصلاح و ترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اُس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے۔ یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے۔ جو بد اخلاقی۔ خود غرضی جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پرواہ ہے۔ وہ قومیں جو اِس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔ جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے۔ کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے۔ کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے۔ اُس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو کیسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں۔ وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں۔ جیسیں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو۔ تو کچھ بھی نہیں۔ (ایضاً)

(۳۰) انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں۔ کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ

مذہب سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔ تمام قوموں میں بہت سی رسمیں وحشیانہ اور ناتربیت یافتہ زمانہ کی اب تک چلی آتی ہیں۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے اُن رسموں کو تراش خراش کرالیا کرلیا ہے۔ کہ اُن میں وحشیانہ پن مطلق نہیں رہا۔ بلکہ نہایت فرحت بخش اور دل کش ہوگئی ہیں۔ اور ناتربیت یافتہ قومیں اب تک بدستور وحشیانہ طور سے اُن کو برتتی آتی ہیں۔ اور اِسی لئے پہلی قومیں پچھلی کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

اکثر قوموں نے قدیم زمانہ میں طریقۂ زندگی بمقتضائے آب وہوا ہر ایک ملک کے اختیار کیا تھا۔ جو اکثر نہایت سادہ وحقارت آمیز تھا۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے اُس میں اِصلاح کرتے کرتے اعلیٰ درجہ کی ترقی اور شائستگی پر پہنچا دیا۔ اور ناتربیت یافتہ قومیں اُسی جہالت میں پڑی رہیں۔ اور اِسلئے پہلی قوموں کی آنکھ میں ذلیل وخوار ہیں۔

یہ امر بھی بہت واقع ہوا ہے۔ کہ بسبب نہونے فن وہنر کے ہر ایک قوم نے جو طریقہ زندگی بسر کرنے کا اختیار کیا تھا۔ وہ اُس زمانہ میں حقیر نہ تھا۔ مگر حال کے زمانہ میں ذلیل ہوگیا ہے چنانچہ جس قدر فن وہنر وصنعت کاری نکلتی آئی۔ اُسی قدر تربیت یافتہ قوموں نے ساز وسامان سے اپنے طریقۂ زندگی کو آراستہ کیا۔ اور جنہوں نے ایسا نہ کیا۔ وہ ویسے ہی حقیر وذلیل ناتربیت یافتہ ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۰)

(۲۷) "خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں"۔ یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اِس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جوش اُس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے۔ جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے۔ تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑھ ہے جبکہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے۔ تو اُس شخص میں سے یا اُس گروہ میں سے وہ جوش اپنے آپ مدد کرنے کا کم ہوجاتا ہے۔ اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی اُسکے دل سے مٹتی جاتی ہے۔ اور اُس کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اُسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے۔ اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو۔ تو وہ ساری قوم دوسری

پہنچاتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۳)

(۲۲) غالباً تمام دنیا اِس بات کو تسلیم کرتی ہے۔ کہ نیکی بلاشبہ نیک ہے اور اِس لئے اِس بات کا ماننا بھی لازم آتا ہے۔ کہ ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل اور اعلےٰ نیکی ہو۔ انسانوں میں نیک وہی ہوگا جس نے بہت سی نیکیاں کی ہوں گی۔ مگر سب سے زیادہ نیک وہی ہوگا جس نے ایسی نیکیاں کی ہوں جو سب نیکیوں سے افضل اور اعلےٰ ہوں۔

اسلئے ہرایک انسان کو ایسی نیکی کی جو ہمیشہ رہنے کی ہے تلاش و تجسس لازم ہے۔

(۲۳) قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت شخصی عزت شخصی ایمانداری شخصی ہمدردی کا اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے۔ شخصی سستی شخصی بے عزتی شخصی بے ایمانی۔ شخصی خودغرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ خود اُسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے اگر ہم چاہیں۔ کہ بیرونی کوشش سے اُن برائیوں کو جڑھ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کردیں۔ تو یہ بُرائیاں کسی اور نئی صورت میں اُس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہوجاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ کی جائے۔ (ایضاً صفحہ ۴۰)

(۲۴) سب سے بڑا عیب ہم میں خودغرضی کا ہے۔ اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہرایک کو ضرور ہے کہ رفاہ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خودغرضی سے تمام قوم کی اور اُس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔ (ایضاً صفحہ ۵۱)

(۲۵) ہماری قومی تہذیب و شائستگی کو اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہرایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنی خاص اوقات کا اور جو کام تمام قوم سے متعلق ہیں۔ اُن میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہئیے۔ کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۲)

(۲۶) قوموں کی عزت یا ذلت اُن کی رسم و رواج اور اُن کے طریقہ زندگی اور کبھی کبھی اُن کے

اُن لوگوں کا خیال تھا۔ جو تم سے پہلے تھے۔ مگر اب اُنہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے۔ جس کے لئے آج ہم اس اسٹیج پر کھڑے ہوئے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۴۰)

(۱۹) اگر میں نے قانون کی تعمیل انصاف کیساتھ بلالحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی۔ تو اُس کے لحاظ سے میں کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھکو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے۔ کہ جو بڑا فرض مجھکو تفویض ہوا ہے۔ اُس کو ایمانداری کیساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہمیشہ خوب سمجھتا رہا ہوں۔ اور دنیا کی دولت اور عزت پر سچ بات کو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو انسان کی قدردانی اور تعریف پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا جواب دہ سمجھا ہے نہ کہ انسان کا۔ گو میں نے اپنی رائے میں غلطی کی۔ مگر ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے۔ باوجود اس کے مجھکو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ کہ جو کوششیں میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں۔ اُنکی قدرشناسی میرے ہموطنوں نے کی ہے (ایضاً صفحہ ۱۲۱)

(۲۰) ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں جن میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کو درجۂ کمال پر پہنچا ہوا اور ناقابلِ سہو و خطا سمجھ کر اُن کے علوم و فنون اور طریقِ معاشرت کو کامل سمجھا۔ اور اُس کی پیروی پر جمے رہے۔ اور اُسکی ترقی اور بہتری پر اور نئی چیزوں کے اخذ و ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی۔ اور دوسری نے کسی کو کامل نہیں سمجھا۔ اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے علوم و فنون و طریقۂ معاشرت کی ایجاد میں کوشش کرتے رہے۔ اب دیکھ لو۔ کہ اِن دونوں میں کیا فرق ہے۔ اور کون تنزل اور کون ترقی کی حالت میں ہے۔ (مضامین تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۶۱)

(۲۱) کیا دھوکے کی چیز ہے۔ کیا بُھلاوے میں پڑے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں۔ کہ دوسروں کی مصیبت میں مدد کرنا ہمدردی ہے۔ کیا قدرت کا کوئی کام بے فائدہ ہے؟ نہیں۔ گو ہم بہتوں کے سمجھنے سے عاجز ہیں۔ کیا ہم اُس فائدے میں شریک نہیں؟ نہیں۔ بیشک واسطہ یا بلاواسطہ یا واسطہ در واسطہ شریک ہیں۔ پھر دوسرے کا مدد کرنا کہاں رہا۔ بلکہ اپنی آسائش کے کسی وسیلہ سے اپنے آپ مدد کرنا ہوا۔ اسلئے جو لوگ ہمدردی کرتے ہیں۔ وہ حقیقت میں اپنی آپ مدد کرتے ہیں۔ اور جو نہیں کرتے۔ وہ خود اپنی آسائش کے وسیلہ کو نقصان

پر ہیں۔اور ہم کو بُرا کہنے پر نہایت تیز زبان۔مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے ہم کو وہی جوش محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے۔اُن کی دین و دنیا کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کا دن رات فکر ہے۔اُن کے غصہ سے ہم کو رنج نہیں اُن کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں۔کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے۔ (حیات جاوید حصہ ۲ صفحہ ۲۸۰)

(۱۶) نیک کام پر کوششیں کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اِسلئے کہ وہ اُن لوگوں کی عادات و رسم و رواج کے مخالف طریقہ پر جن کی بھلائی کیلئے کوشش کی جاتی ہے۔قائم کی گئی ہیں۔برباد ہوگئیں ہیں حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے۔اور خود اُس نیکی کی رکاوٹ کا آلہ بننا ہے۔خدا نے یوشع کے لئے سورج کا تھم جانا کہا حالانکہ شاید وہ غلط تھا۔کیونکہ اگر وہ واقع بھی ہوا۔تو شاید زمین کا تھم جانا سچ ہوتا۔مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی جو اُس زمانہ میں تھی۔رعایت کی۔پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے۔تو خود خدا کی اِس حکمت عملی کو توڑیں گے۔اور خود اپنے نقصان کا باعث ہونگے۔ (ایضاً۔صفحہ ۳۵۲)

(۱۷) لوگ اصلاح اور ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں۔مگر میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے۔بلکہ اختلاف ہے۔جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو۔اُس کو چاہئیے۔کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اُس رسم کو توڑے یا اُسمیں اصلاح اور ترقی کرے۔بیشک تمام قوم اُس کو برا کہے گی اور نکو بنائے گی۔مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اُس کی پیروی کرنے لگیں گے۔اور جس طرح کہ اولاً وہ ہدفِ تیر ملامت ہوا تھا۔انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جائیگا۔ایضاً صفحہ ۳۵۵

(۱۸) اے رئیسو اور اے دولتمندو ! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی بُری حالت ہو۔مگر ہمارے بچوں کے لئے سب کچھ ہے۔یہی

(۱۲) جو شخص سچے دل سے اور نیک نیتی سے کسی کام کو کرتا ہے۔ اُس کو بُرا کہنے والوں سے غرض نہیں ہوتی۔ اُس کو خدا سے غرض ہوتی ہے۔ اور جبکہ خدا سے غرض ہے تو لوگوں کے بُرا کہنے سے اُس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ اُس کی محبت بڑھتی جاتی ہے اور وہ زیادہ کوشش کرنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور سمجھانے کے لئے زیادہ کوشش درکار ہے۔ اور جوں جوں مخالفت بڑھتی جاتی ہے اُس کی کوشش بھلائی کے واسطے ترقی کرتی جاتی ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۷۵)

(۱۳) کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں۔ کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں۔ اور دوسرا نشان یہ ہے۔ کہ اُس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کردیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۷۹)

(۱۴) سچ ہے۔ انقلابِ زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے۔ کہ آدمی کو نہایت زبون و درماندہ کر دیتا ہے۔ ایسے وقت میں انسان کا فضل و کمال عقل و ہنر۔ علم و عمل کچھ کام نہیں آتا۔ یہی وہ حادثہ ہے جس سے انسان کا پالپٹ ہو جاتا ہے۔ کوئی کام اُس کا اعتبار کے لائق نہیں رہتا۔ کسی شخص کو اُس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں رہتا۔ جو کام انسان سے بُرا سرزد ہوتا ہے وہ تو بُرا ہے ہی۔ مگر اُس کمبخت وقت کا مقتضا یہ ہوتا ہے۔ کہ اُس کا اچھا کام بھی بُرائی اور ظاہر داری پر محمول ہوتا ہے۔ ہر ایک قوم میں اچھے بُرے سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ جو ایک مثل مشہور ہے۔ "ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرے"۔ یہ خاص ایسے ہی بُرے وقت کے لئے کہی گئی ہے۔ اِس کمبخت وقت کا یہ خاصہ ہے۔ کہ اگر ایک آدمی بھی بُرا کام کرے۔ تو ساری قوم کی قوم رُسوا اور بدنام ہو جاتی ہے۔ گو اُسی قوم میں صدہا آدمیوں نے اچھے کام کئے ہوں۔ مگر اِن خوبیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا۔ (حیاتِ جاوید حصہ ۱۔ صفحہ ۹۴)

(۱۵) بعضے تو ہم کو بُرا کہتے کہتے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ اور بعضے نئے دل جوش

یا تحقیقات کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اور اُس بات کے فائدہ سے محروم رہتے ہیں۔.... (مضامین تہذیب الاخلاق جلد ۲ صفحہ ۱۱۴)*

(۹) کوئی وقار اور کوئی عزت کسی قوم کو اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جبتک وہ حکمران قوم کے ساتھ درجہ حاصل نہ کرے اور اپنے ملک کی حکومت میں حصہ نہ لے دوسری قومیں مسلمان یا ہندوؤں کو محرری یا ادنےٰ عہدوں پر دیکھکر عزت نہیں کرتیں اور نہ کرسکتی ہیں۔ بلکہ جو گورنمنٹ اپنی رعایا کو اس قسم کے اعزاز سے محروم رکھے۔ وہ بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ عزت تب ہی حاصل ہوگی جب ہمارے ملکی بھائی حکمران قوم کے ساتھ برابر کے عہدے رکھتے ہوں۔ گورنمنٹ نے صداقت اور نیک نیتی نیک دلی اور انصاف سے اپنی ہر ملک کی رعایا کو اُن عہدوں کے پانے کے لئے برابر کا حق دیا ہے۔ البتہ ہندوستانیوں کے لئے بہت سی مشکلات اور بے انتہا موانع ہیں۔ مگر ہم کو استقلال کے ساتھ کوشش کرنی چاہیئے۔ کسی تکلیف کسی مشکل کسی مصیبت کے خوف سے پیچھے نہ رہنا چاہیئے۔ (سفرنامہ پنجاب صفحہ ۷۶ ـ ۷۷)

(۱۰) دنیا میں عزت ایک بڑی چیز ہے۔ مگر وہ ہر شخص کو فرداً فرداً کسی طرح نہیں مل سکتی۔ جب تک کہ اُس قوم کو جس میں کا وہ شخص ہے۔ عزت حاصل نہ ہو۔ اگر ایسی قوم میں سے جو ذلیل ہے۔ کسی خاص شخص کو عزت حاصل ہو تو اُس سے قوم کو تو کیا عزت ہوگی۔ وہ خود اِس وجہ سے کہ وہ اُسی ذلیل قوم میں کا شخص ہے ہمیشہ ذلیل ہی رہیگا۔ پس جو لوگ اپنی عزت چاہتے ہیں اُن کا بھی فرض ہے کہ قوم کی عزت بڑھانے میں کوشش کریں۔ جب قوم ذلت سے نکل جاوے گی اور پھر اُس میں سے کوئی شخص کسی قسم کی عزت حاصل کریگا۔ تو اُس کی اصلی عزت ہوگی اور وہ بھی کل قوم کی عزت کا باعث ہوگا۔ امید ہے کہ مجھ مسافر کی اِس صدا کا آپ ہمیشہ خیال رکھیں گے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۸۰)

(۱۱) قومی کام میں واقعی اُس وقت تک مدد نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ لوگوں کے دلوں میں ملک کی بھلائی قومی ہمدردی اپنے ملک کے تمام بچوں کی تربیت کا جوش نہ آجائے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۸۵)

نہیں ہوتے۔ (ایضاً)

(۴) سب سے بڑا نشان قومی تنزل کا حکومت یا سلطنت کا تقسیم ہو جانا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۶)

(۵) کاہلی۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا۔ کام۔ کاج۔ محنت۔ مزدوری میں چستی نہ کرنا۔ اُٹھنے۔ بیٹھنے۔ چلنے۔ پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قوٰے کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔ (تہذیب الاخلاق*۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۱)

(۶) جس طرح ہم اپنے محسنوں کا احسان نہیں بھول سکتے۔ اُسی طرح نامہربان افسروں کی شکایت ہمارے دل سے فراموش نہیں ہو سکتی۔ (حیات۵ جاوید حصہ ۲۔ صفحہ ۳۸۲)

(۷) ہم کو خدا نے دنیا میں اسلئے پیدا کیا ہے۔ کہ سب کی بھلائی چاہیں۔ بُرا کرنے والے کی بُرائی سے ہم کو کیا کام ہے؟ ہم کو اپنا دل۔ اپنا کام۔ اپنی زبان بھلی رکھنی چاہئے۔ بُرائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا کرنا ہے۔ جو لوگ بُرا کہنے والے ہیں۔ اُن کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہئے۔ اگر وہ بُرائی ہم میں ہے۔ اُس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے۔ اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے۔ کہ وہ بُرائی ہم میں نہیں ہے۔ بُرا کہنے والے کی نسبت خیال ہی نہیں چاہئے۔ کہ کون ہے؟ دنیا میں ہے بھی یا نہیں۔ پس یہی آرام و آسائش کا طریقہ ہے۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ دنیا میں آرام سے رہو۔ تو یہی طریقہ اختیار کرو۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۱۴)

(۸) جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے۔ تو اُس میں سعی اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کے ایجاد سے باز رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اُس چیز میں جس کو کامل سمجھا تھا۔ زوال آجاتا ہے۔

کسی شخص یا کسی قوم کو کسی چیز میں کامل سمجھ لینا بہت سی خرابیوں و نقصانوں کا باعث ہوتا ہے

جو چیز کہ حقیقت میں کامل نہیں ہے ہم اسکو غلطی سے کامل سمجھ لیتے ہیں۔

ہم میں ایک استغنا پیدا ہوتا ہے۔ جس سے سوائے اُس کے اور کسی بات

* مطبوعہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ پریس

۵ مطبوعہ نامی پریس کانپور

قومی

(۱) "ہمارے بعد ہمارا نام رہیگا" یہ ایک نہایت لغو اور بے ہودہ خیال ہے جس کا کچھ نتیجہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ خیال خام ہے اور انسان کے بودے پن کی دلیل ہے انسان کو ہمیشہ یہ خیال رہنا چاہئے کہ میں کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے انسانوں کو قوم کو فائدہ پہنچتا رہے۔ یہ خیال بہت صحیح ہے۔ کیونکہ اپنی ذات کے واسطے نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ ذات بھی فنا ہو جائے۔ بلکہ زندہ لوگوں کے لئے ہے۔ اور ایسوں کے لئے ہے جن کا سلسلہ برابر قیامت تک جاری رہیگا* (سرسید کے آخری مضامین صفحہ ۲۷)

(۲) ہر ایک قوم کی ترقی۔ عروج اور ناموری کی ایک عمر ہوتی ہے جس طرح کہ ایک انسان کی انسان پیدا ہوتا ہے۔ بڑھتا ہے۔ جوان ہوتا ہے۔ بڈھا ہوتا ہے اور اخیر کو مر جاتا ہے۔ اُس کے بڑھنے۔ جوان ہونے۔ بڈھا ہونے۔ مرنے کے طبعی اسباب ہوتے ہیں۔ جو کسی کے روکے سے رُک نہیں سکتے۔ اسی طرح ایک وحشی قوم ترقی کرتی ہے۔ نام آور ہوتی ہے۔ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ پھر تنزل شروع کرتی ہے۔ بڑھاپا اُس پر آجاتا ہے۔ اور پھر ایسی گمنام ہو جاتی ہے کہ اُس پر موت کا اطلاق ہوتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۹)

(۳) قوم کا تنزل ایک طبعی امر ہے۔ جس طرح انسان کا بڈھا ہونا ایک طبعی امر ہے بڑھاپے کے امراض کو لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ مرض ہے مگر نہ اُس کی دوا ہو سکتی ہے اور نہ وہ جا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ طبعی ہوتے ہیں۔ اور طبیعت بدلتی نہیں۔ جو لوگ قوم کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ وہ اُن مرضوں کی تشخیص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ کہ اُن کا علاج ممکن ہے۔ اور نہایت کوشش سے اُس کے علاج پر متوجہ ہوتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں۔ کہ ہمارے ہی قصور اور غفلت سے یہ مرض لگ گئے ہیں۔ مگر در حقیقت یہ بات پوری نہیں ہوتی بلکہ قوم کی طبیعت ہی ایسی ہو جاتی ہے۔ کہ وہ امراض جو باعث تنزل ہیں خود قوم کی طبیعت بن جاتے ہیں اور علاج پذیر

* مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور

اُن کے حسن و قبح کو عقل تسلیم کرتی ہے۔

فہذا اعتقادی باللہ الواحد الاحد الصمد الذی لم یلد و لم یولد و لم یکن لہ کفواً احد وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال لا الہ الا اللہ مستیقنا بہا قلبہ دخل الجنۃ فانا من اہل الجنۃ انشاء اللہ تعالیٰ بحرمۃ سیدنا محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تسلیما کثیراً کثیرا۔

(مضامین تہذیب الاخلاق۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۷۰)

مطبوعہ نولکشور پریس لاہور

سمت ہوگی نہ یہ بصر۔ نہ صورت ہوگی نہ شکل۔ نہ رنگ ہوگا نہ کوئی ڈھنگ۔ نہ مقابلہ ہوگا نہ آمنا سامنا۔ محض ہُو کا مقام ہوگا۔

کفر و معاصی کا بھی اُسی قانون قدرت کے موافق وہی خالق ہے۔ مگر اُس نے اپنے قانون قدرت سے انسان کو ایسا بنایا ہے جس میں اُن سے بچنے کی قدرت رکھی ہے اِس لئے اگرچہ خدا اُن کا خالق ہے مگر خود انسان اپنی قدرت و اختیار سے اُن کا کاسب ہے گو کہ بلحاظ قانون قدرت کاسب کا بھی خدا ہی پر اطلاق ہو سکے مگر اُسکو نہ کفر و معاصی سے کچھ نقصان ہے اور نہ عبادت کی حاجت۔

اُس کے تمام کام سراسر حکمت ہیں۔ جو کچھ کہ اُس سے ہوا وہ سب نیک ہے کما قیل۔ آنچہ از پردہ خفا بمنصہ ظہور جلوہ گر است ہمہ نیکو است ؎

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نرفت
آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد

پس جور و ظلم کی نسبت اُس کی طرف نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی مخلوق کو پیدا کرتا ہے۔ جس طرح کہ اُس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔ عدل و حکمت کے لئے ہر ایک کو اُسی کے حال میں دیکھنا چاہئے نہ نسبتہً کیونکہ عدل و حکمت نسبتی چیز نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لئے بمنزلہ اُس کے خاصہ کے ہے جس کی تعریف میں آیا ہے۔ ما یوجد فیہ ولا یوجد فی غیرہ۔

اُس کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ مگر اِس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ وہ اندھا دھندی سے لغو و بے فائدہ احکام جاری کرنے لگے۔ پس یہ اعتقاد رکھنا کہ حسن و قبح اشیاء کی اور کسی فعل پر ثواب یا عقاب ہونا صرف خدا کے حکم اور اُس کے امر و نہی کے سبب سے ہے محض لغو اعتقاد ہے بلکہ حسن و قبح اشیاء کی اور کسی فعل پر ثواب و عقاب کا ہونا اُسی قانون قدرت پر مبنی ہے اور خدا کے احکام اُسی قانون قدرت کا بیان ہے پس اُن میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ اُن کے حسن و قبح کو ابتداءً ہی عقل انسان کی دریافت کر لیتی ہے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ بعد الاخبار من الرسل عن اللہ تعالےٰ

ٹالتا ہے اور وہی خوشیوں کو لاتا ہے مگر یہ سب باتیں اپنے قانون قدرت کے مطابق کرتا ہے۔

اُس کا قانون قدرت کبھی ٹوٹتا نہیں۔ وہ ہر طرح کے قانون قدرت کے بنانے پر قادر ہے۔ مگر جو قانون قدرت کہ اُس نے بنا دیا۔ پھر اُس کے برخلاف کچھ ہوتا نہیں۔

قدرت کے قانون بنانے میں کسی سبب کا محتاج نہیں بدیع السموات والارض واذا قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون۔ امر کے لفظ سے وہی قانون قدرت مراد ہے جسکو بغیر کسی سبب کے صرف کُن کے لفظ سے یعنی ارادہ سے جو مقتضائے کمال ہے بنا دیتا ہے۔

وہ کسی میں سماتا نہیں اور نہ کسی میں ملتا ہے۔ اُس میں تعدد و حدوث آ ہی نہیں سکتا۔ نہ اُس کی ذات میں اور نہ اُس کی صفات میں اُس کا تعلق متعلقات سے بھی حادث نہیں ہے بلکہ ظہور متعلقات سے اُن کے وقتوں میں وہم حدوث اور خیال تعدد ہوتا ہے۔ مگر اُس میں نہ حدوث ہے اور نہ کسی طرح کا تعدد۔

وہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے نہ جسم ہے نہ کسی محدود جگہ میں ہے نہ کسی خاص جگہ میں ہے نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں ہے یا وہاں ہے۔ نہ اُس میں حرکت اور نہ اُسپر سکون کا اطلاق ہوسکتا ہے اور نہ اُس کی نسبت کسی جگہ سے آنا اور کسی جگہ میں جانا بولا جاسکتا ہے۔ اُس کے لئے کوئی طرف و سمت متعین نہیں۔ اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ اُس کا عرش پر ہونا صرف انسانوں کو اُس کی بڑائی کا خیال دلاتا ہے نہ اُس کا عرش پر یا اوپر کی سمت پر ہونا۔ اوپر تو ایک اضافی سمت ہے جو ہماری اوپر کی سمت ہے وہ کسی دوسروں کے نیچے کی سمت ہے مگر عرش پر ہونے سے ہر ایک کے دل پر وحشی سے لیکر مہذب فلسفی تک کے دل پر اُس کی بڑائی کا خیال آتا ہے۔

مرنے کے بعد مومنین و موحدین اُس کو دیکھیں گے۔ وہ ایک ایسا روحانی انکشاف ہوگا جو عقلی تصدیق سے جیسے کہ اس دنیا میں ہم رکھتے ہیں بدرجہا بڑھ کر ہو جس کی نسبت عرف عام میں آنکھوں سے دیکھنا کہا جاتا ہے مگر اس رویت کے لئے نہ

اعتقادی باللہ

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ

میں نہایت سچے دل سے اِس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ تمام عالموں کا بنانے والا کوئی ہے اور اُسی کو ہم کہتے ہیں اللہ۔ وہ ہمیشہ سے ہے۔ اور ہمیشہ رہیگا۔ اُس کا ہونا ضروری ہے۔ اور اُس کا نہ ہونا ممکن نہیں۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ اور تمام صفات کمال اُس کی ذات میں موجود ہیں۔ اُس کا سا کوئی نہیں نہ ہونے میں۔ کیونکہ ہونا اسکی ذات سے ہے۔ اور نہ کسی صفت میں کیونکہ اُس کی تمام صفتیں ہی اُس کی ذات سے ہے وہ زندہ ہے نہ جان سے بلکہ اپنی ذات سے۔ وہ جانتا ہے نہ کسی جاننے والی چیز سے بلکہ اپنی ذات سے۔ وہ دیکھتا ہے نہ کسی دیکھنے والی چیز سے بلکہ اپنی ذات سے وہ سنتا ہے نہ کسی سننے والی چیز سے بلکہ اپنی ذات سے۔ وہ بولتا ہے نہ کسی بولنے والی چیز سے بلکہ اپنی ذات سے۔ وہ تمام نقصانوں سے پاک ہے۔ اور تمام عیبوں سے بے عیب۔ یہ مثل ہے کہ بے عیب ذات خدا کی ہے۔ بالکل اُس پر ٹھیک ہے۔ تمام مخلوقات کا وہی خالق ہے۔ اور تمام معلومات کا وہی عالم ہے۔ سب ممکن چیزوں پر قادر ہے۔ الحی القائم ہے۔ دانا و بینا ہے۔ نہ اُس کا کوئی مشابہ ہے۔ اور نہ اُسکا کوئی مصاحب اور مددگار اور نہ اُس کی مانند کوئی ہے اور نہ اُس کا کوئی شریک نہ وجوب وجود میں اور نہ استحقاق عبادت میں۔ اور نہ پیدا کرنے میں۔ اور نہ صلاح وتدبیر بنانے میں۔ پس اُس کے سوا کوئی کسی قسم کی عبادت یعنی اظہار اپنے تذلل اور اُس کی غایت الغایت تعظیم کا مستحق نہیں ہے۔ پس ہمارے تذلل کا اور جو طریقہ اُس کی تعظیم کا ٹھہرایا گیا ہو۔ اُس طریقہ کی تعظیم کا استحقاق اُس کے سوا دوسرے کو نہیں۔

وہی بیمار کو اچھا کرتا ہے۔ اور وہی سب کو رزق پہنچاتا ہے۔ وہی بلاؤں کو

کہ تھوڑی سی تعلیم اور بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے ایسے عظیم الشان کام انجام کر سکتی ہیں۔ جو بڑے بڑے حکیموں اور مدبروں سے انجام نہیں ہو سکتے۔ وہ ہم کو تعصبات سے متنفر کرتی ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ حسن معاشرت سکھاتی ہے۔ دوستوں کیساتھ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان عیسائی ہوں یا یہودی۔ خلوص اور سچائی سے ملنا بتاتی ہے۔ وہ ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جیسا دل میں سمجھو۔ ویسا ہی زبان سے کہو۔ اور جو کچھ کہو۔ اُس کو کر دکھاؤ وہ باآواز بلند کہتی ہے۔ کہ وقت کی قدر کرو۔ ڈیوٹی کا خیال رکھو۔ ایک لمحہ بیکار نہ رہو اور کام کرتے کرتے مر جاؤ۔"

لاہور

مورخہ یکم جولائی ۱۹۱۴ء

ملک و قوم
کا
ناچیز و حقیر خادم
شیخ ضیاء الحق سابق اڈیٹر پیشوا

کو نیست ونابود کر دیتی ہے۔

اب ہم واجب التعظیم مولانا حالی مدظلہ العالی کے وہ الفاظ حیات جاوید سے بجنسہ نقل کرکے اپنے اِس مختصر دیباچہ کو ختم کرتے ہیں جن میں اُنہوں نے اہلِ وطن کو مخاطب کرکے بتایا ہے۔ کہ سرسید کی لائف ہمارے لئے ایک ایسی مثال ہے۔ جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی یہ کٹھن منزل جو تنگنائے دنیا میں ظاہرا اُس کی سب سے آخری منزل ہے۔ آسانی کیساتھ طے ہو جائے۔ اِس بزرگ کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے" کہ

"زمانہ کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھ کر اُس کیساتھ موافقت پیدا کرو۔ تاکہ دنیا میں آرام سے رہو۔ اور عزت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے۔ تو عمدہ رعیت بننے میں کوشش کرو۔ تاکہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو وہ بتاتی ہے۔ کہ کوئی قوم محکوم ہونے کی حالت میں کیونکر قومی عزت حاصل کرسکتی ہے۔ اور ایک شائستہ گورنمنٹ میں کیونکر اُس کا رسوخ اور اعتبار بڑھ سکتا ہے۔ وہ جس طرح ہم کو آزادی رائے کی تعلیم دیتی ہے۔ اُسی طرح یہ بھی سکھاتی ہے۔ کہ ہم کیونکر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں وہ ایک طرف ہم کو خودداری اور سلف رسپکٹ کی تاکید کرتی ہے اور غلامانہ خوشامد سے نفرت دلاتی ہے۔ اور دوسری طرف حکمران قوم کا ادب اور اُسکی بزرگداشت ہمارے دلوں پر نقش کرتی ہے۔ وہ ہم کو خبردار کرتی ہے۔ کہ قومی تنزل سے قوم کن آفتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور اُس کا علاج کیا ہے۔ وہ ہم کو اسلام کے وہ اعلیٰ اصول یاد دلاتی ہے۔ جن کو قرونِ اولیٰ کے بعد قوم نے بالکل فراموش کردیا تھا۔ اور جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ قوم اور وطن کی محبت کو جزو ایمان جانو۔ اور قوم کی خدمت کو سرداری کا تمغہ سمجھو۔ وہ ہم کو سبق دیتی ہے۔ کہ قوم کی خیرخواہی اُس وقت تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ بہت سے کام اُن کی عقل اور عادت اور مرضی کے خلاف نہ کئے جائیں اور اُن کی مخالفت کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت نہ کیا جائے۔ وہ ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ اگر دنیا میں بڑا بننا چاہو۔ تو حرص۔ طمع۔ خودغرضی جھوٹ۔ آرام طلبی۔ اور عیش و عشرت سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤ۔ وہ ہم کو یقین دلاتی ہے

" بلکہ ادب و تعظیم سے اُن کا ذکر کریں۔ خواہ وہ لوگ ہندو ہوں یا پارسی عیسائی "
" ہوں یا یہودی۔ یا خود مختلف عقائد کے مسلمان ہی ہوں۔ اگر ہم اُن کے بزرگوں "
" یا پیشواؤں کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں گے۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ وہ اُسی طرح "
" ہمارے بزرگوں اور پیشواؤں کیساتھ گستاخی اور بے ادبی سے پیش نہ آئیں۔ "
" علاوہ اِس کے اخلاق اور متانت سے نہایت بعید ہے۔ کہ ہم کسی مذہب کے پیشوا "
" کا بے ادبی سے ذکر کریں۔ "

اُن کا قول تھا۔ کہ " **ہندو مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے۔ جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں** "

ہر انسان کا لازمی فرض وطن اور اہلِ وطن کی محبت اور خدمت ہے۔ اور مادرِ وطن کے ہر فرزند کو حتی الامکان اِسے مذہبی۔ اخلاقی بلکہ الٰہی فرض سمجھ کر کوشش و ہمت کرنی چاہئے کہ وہ بقدر اپنی حیثیت اور طاقت کے جو کچھ بھی اُس سے ہو سکے۔ کرے۔ ملک و قوم کی موجودہ حالت اتحاد و اتفاق کی ضرورت کو بڑے زور سے محسوس کر رہی ہے۔ اور قومی لیڈر اِس جدوجہد میں لگے ہیں۔ کہ سب کو اتحاد و اتفاق کی ایک لائن پر لا کھڑا کریں۔

اِسی ضرورت کو محسوس کر کے اور یہ خیال کر کے جو کچھ بھی ہو سکے قوم و ملک کیلئے کرنا چاہئے خواہ تھوڑا اور بالکل ہی تھوڑا کیوں نہ ہو۔ یہ کتاب اہلِ وطن کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ جس میں اتفاق استقلال۔ ہمت۔ کوشش۔ قومی و ملکی ترقی۔ اتحاد و اتفاق۔ تعلیم و تربیت اخلاق و تمدن وغیرہ۔ پُر موثر و دلپذیر نصائح اور عملی ہدایات ہیں۔ اور جن سب کا انتہائی مقصد اور نتیجہ ایک واجب الادب محبِ وطن کے اِن الفاظ میں اپنی جھلک دکھلا رہا ہے

" اپنے ملک کو تم اپنا مندر سمجھو۔ جس کی چوٹی پر خدا اور بنیاد میں اُن لوگوں کی "
" قوم ہے۔ جو سب آپس میں برابر ہیں۔ "

یہ بنیاد ہے۔ اُس برادرانہ اتحاد و محبت اور قومی یگانگت کی جس پر قوموں کے اُس عالمگیر مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ جو ملکی و قومی ترقی۔ سرسبزی و شادابی کا مسلّم اور حقیقی ذریعہ ہے۔ اور جس کی فتحمند طاقت تمام خارجی و باطنی اسباب تباہی و بربادی

" * * * * آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جو آپ نے "
" قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لئے کی ہیں۔ "
" * * * ہندو راجہ مہاراجہ (غالباً یہ اشارہ راجہ شیو پرشاد "
" کی طرف ہے) جن سے بہت کچھ امید کی جاتی تھی۔ ملک کے لئے خیر خواہ "
" نہ ثابت ہوئے * * * * لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے "
" نہ دیا۔ اور آلبرٹ بل اور دیگر مفید ملک تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ "
" حمایت کی۔ "

مندرجہ کتاب ہذا مقولے سر سید کے تمام لکچروں۔ تقریروں۔ مضامین اور تمام تصانیف سے انتخاب کر کے ملک و قوم کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں جو مذہبی مقولے ہیں۔ اُن سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ کسی خاص فرقہ یا مذہب سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ سر سید کے وہ خاص محققانہ اور جدت کا پہلو لئے عالی و عظیم خیالات ہیں جن سے ہر ایک ذہب عقیدہ اور خیال کا انسان اپنی لیاقت و عقل کے لحاظ سے مستفید ہو سکتا اور اپنے علومات مذہبی میں ایک معقول و مفید اضافہ کر سکتا ہے۔ وہ ایک حقیقت۔ نکشاف مفید و جدید معلومات کا خزانہ اور مصنف کی طبعی جامعیت۔ مجددانہ عظمت۔ فطرتی عالی دماغی کی مستحکم شہادت ہیں۔

سر سید کو قومی اور مذہبی تعصب سے سخت نفرت تھی۔ وہ ہمیشہ اُسکی بُرائی کرتے اور ل وطن کو ہدایت کرتے ہیں۔ کہ وہ اِس ترقی و بہبودی کے سدراہ خطرناک۔ نفرت انگیز صلت کے پاس ہو کر بھی نہ نکلیں۔ وہ تمام پیشوایان مذہب کے ادب و احترام کی اپنے س مقولہ میں نصیحت کرتے ہیں۔

" ہم کو نہایت افسوس ہے۔ کہ جب ہم مذہبی مباحثوں کی کوئی کتاب دیکھتے ہیں "
" تو اُس میں ایک مذہب دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا بُری طرح پر ذکر کرتا ہے "
" یہ امر مذہب اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ جس مذہب کے جو پیشوا ہیں جب "
" ہم اپنے مذہبی مباحثوں میں اُن کا ذکر کریں۔ تو ہم کو لازم ہے۔ کہ اُن کو بُرا نہ کہیں "

" اسی پر مرتے ہو۔ اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو۔ کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ "
" ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں۔ اِس "
" اعتبار سے سب ایک قوم ہیں جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ تو "
" اِن سب کو ملکی فائدہ میں جو اِن سب کا ملک کہلاتا ہے۔ ایک ہونا "
" چاہیئے۔ "

سر سید کی بے تعصبی۔ عام محبت اور اُن کی قومی و ملکی کوششیں جو انہوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت کیں مفصلہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہیں۔

اخبار ٹریبون (لاہور) نے اپنے پرچہ مورخہ ۹ فروری ۱۸۸۴ء میں یہ ریمارک کیا تھا۔ کہ
" ہم اس شخص کے کلمات کو سنکر جیسے کہ ہم اکثر اپنے مسلمان ہموطنوں کی زبانی نہیں سنتے "
" ہیں۔ دل سے خوش ہوتے ہیں۔ جو نظیر سید احمد خان بہادر نے قائم کی ہے۔ وہ "
" صرف اُن کے ہم مذہبوں ہی کی پیروی کی لائق نہیں ہے۔ بلکہ ہندوؤں کی پیروی "
" کے بھی لایق ہے۔ اور ہم یقین کرتے ہیں۔ کہ اُس کی کثرت سے پیروی کی جائے گی "

اس سفر پنجاب میں طلباء گورنمنٹ اسکول جالندھر کے اڈریس میں جسے لالہ بھگت رام صاحب نے (جو اس وقت جماعت پنجم کے طالب علم تھے) پڑھا تھا یہ فقرات درج ہیں۔
" جناب سید صاحب صرف ایک قوم یا ایک خاص فرقہ کے مددگار نہیں ہیں۔
" بلکہ وہ جناب بابو کیشب چندر سین اور سری سوامی دیانند سرستی کے پیروؤں کو "
" بھی اُسی نظر عنایت سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ خاص مسلمانوں کے ہی معاون نہیں "
" ہیں بلکہ وہ کل ملک کے مددگار۔ کُل ہندوستان کے جاں نثار ہیں۔ آج کا دن "
" جالندھر کے واسطے عموماً اور ہم طلباء کے واسطے خصوصاً ایک مبارک دن ہے "
" جس میں ہم کو ایک حامیٔ قوم اور معاون ملک بزرگ کی زیارت نصیب ہوئی۔ "

اسی طرح برہمو سماج او آریہ سماج کے ایک معزز ڈیپوٹیشن نے سر سید کی ممبریٔ کونسل کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے۔ کہ

ہم ممبران آریہ سماج اور برہمو سماج لاہور تمام ہندوؤں کی طرف سے "

ڈال کر تمام دماغی اور عقلی طاقت کا زور اور جوش اِس پر صرف کر دیا تھا۔ کہ

"سر سید کانگرس کے مخالف اور مسلمانوں کو شمولیت سے باز رکھتے ہیں"

عقلی اور امکانی دلائل و واقعات پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتے۔ جو کچھ اُس وقت کہا گیا۔ محض بے سود اور سطح کو مجسم کر دکھانا۔ اور قبل از وقت واویلا تھا۔ کیونکہ قوم مقابل اِس جدوجہد میں حصہ لینے کی نہ طاقت رکھتا تھا نہ لیاقت۔

اب بھی تو وہی مسلمان ہیں۔ اور پہلے بھی یہی مسلمان تھے۔ اِس سے زیادہ کوئی روشن اور واضح دلیل نہیں ہو سکتی۔ کہ شمولیت اور شراکت حقوق کی حفاظت۔ پولیٹیکل معاملات میں حصہ لینے۔ رائے دینے مختصر یہ کہ جدوجہد کا جو زمانہ تھا۔ وہ آ گیا۔ اور اُس نے خود متوجہ اور مخاطب کر لیا۔

کتاب ہذا میں سر سید کے جس قدر مقولے جن مختلف عنوانوں پر ہیں وہ سب ملک و قوم سے متعلق ہیں۔ اور جن کا حقیقی اور اعلیٰ مقصد اور ذاتی خوبی۔ اخلاقی و ذہنی آزادی ہے۔ ان سے ہر ایک انسان خواہ وہ کسی مذہب۔ عقیدہ اور خیال کا ہو مستفیض اور مستفید ہو سکتا ہے۔ جیسے سر سید کی ذات قوم کے لئے احسان عام تھی۔ ویسے ہی اُن کے خیالات بہبودی۔ بہتری۔ ترقی۔ و کامیابی عام پر ہیں۔ اِس محب وطن شیدائے قوم کو جس قوم کا اِس قدر درد۔ سوز اور جس کی اِس قدر محبت تھی۔ اُس قوم کی تعریف وہ خود اِن الفاظ میں کرتا ہے۔

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف"
"لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین"
"مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو"
"اُن میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم"
"کہلاتے ہیں۔ غرضکہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو اُن میں"
"بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو اور مسلمانوں! کیا تم ہندوستان کے"
"سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اِسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اِسی"
"زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اِسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے ہو؟"

اِس مسئلہ پر سرسید نے ہر جگہ اور ہر موقع پر نہایت تفصیل و تشریح کیساتھ لکھا اور کہا ہے
دلی جوش اور محبت کیساتھ اِس کی حقیقی اور ذاتی خوبیوں کو موثر و ممتاز مثالوں سے اہل ملک
پر ثابت کیا ہے۔

اُن کا سب سے زیادہ مشہور مقولہ زبان زد خاص و عام یعنی

" میں نے بار ہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں۔ کہ ہندوستان ایک دُلہن کی مانند "
" ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو و مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں "
" آپس میں نفاق رکھیں گے۔ تو وہ پیاری دُلہن بھینگی ہو جاویگی۔ اور اگر ایکدوسرے "
" کو برباد کر دیں گے۔ تو وہ کانڑی بن جاویگی۔ پس اے ہندوستان کے "
" رہنے والے ہندو مسلمانوں! اب تم کو اختیار ہے۔ کہ چاہو اُس دلہن کو بھینگا "
" بناؤ۔ چاہو کانڑا۔ "

درحقیقت انڈین پالیٹکس کی جان ہے۔ اور اِس کے سامنے قومی کارکنوں کے تمام اصول خیالات اور قومی و ملکی سرسبزی و شادابی کے عقیدے خواہ وہ ماڈریٹوں کے ہوں یا اکسٹریمٹوں کے۔ پھیکے اور ماند ہیں ہمیں لازم ہے۔ کہ اِس زبردست اصول یا عقیدے کو جزو ایمان بنائیں۔ اُس عالمگیر مذہب میں ایمان رکھتے ہوئے جو قوموں کے باہمی اتحاد و یگانگت کا عالمگیر مذہب ہے جس کے سامنے تمام پولٹیکل نزاکتوں اور اُلجھنوں کا مطلع صاف ہو جاتا۔ اور تمام اسرار و مشکلات کا سمندر جو قومی و ملکی ترقی کا سدّ راہ ہوتا ہے۔ ہٹ جاتا ہے۔ صرف اِسی ایک اصول پر عمل کرتے ہوئے ہم ترقی کے اُس زینہ پر پہنچ سکتے ہیں جو ہمارے موجودہ اور گذشتہ لیڈروں اور محبان وطن کا نصب العین رہا ہے اور ہے۔

سرسید کے پالیٹکس پر نکتہ چینی کرنیوالوں کو نہایت غور اور صبر و تامل کیساتھ سرسید کے قومی۔ ملکی اور باہمی اتحاد کے مقولوں کو پڑھنا چاہیئے۔ اور اُس کے بعد رائے قائم کرنی چاہیئے۔ ابتدائے نیشنل کانگرس میں جو نکتہ چینی کی گئی۔ اور فضول اعتراضوں کے ردّے جمائے گئے۔ وہ واقعیت و اصلیت سے کوسوں دور تھے۔ اُن کی بنا ایک نفسانی دانائی اور پالیسی پر تھی جس میں مسلمانوں کی اُس وقت کی تعلیمی و تمدنی مشکلات کو پس پشت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

سرسید ایک خاص دل ودماغ اور فطرت وطبیعت لیکر دنیا میں آئے تھے وہ اُن پاک ذات اور پاک نہاد لوگوں سے تھے جن کا ملک و قوم پر ظاہر ہونا مرضی و منشاء الٰہی سے ہوتا ہے۔ اور جن کو خدا ملک و قوم اور نوع انسان کی خدمت سپرد کرکے ان کا رہنما ہادی اور پیشوا بناتا ہے۔

سرسید کی زندگی اور اُنکی زندگی کے کارنامے (جو ہمارے لئے قیمتی برکتوں اور نعمتوں کا مجموعہ ہیں) دنیا اور اہلِ دنیا پر ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ وہ ہمارے اور ملک کیلئے خدا کی خاص رحمت اور برکت تھے۔

سرسید کی ملکی و قومی، اخلاقی و تمدنی ہدایتیں۔ باہمی اتحاد و اتفاق۔ تعلیم و تربیت پر موثر علمی نصیحتیں اِس بات کی مستحکم اور کامل شہادت ہیں۔ کہ وہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کی ترقی و کامیابی اور حقیقی نجات کا ایک طاقتور۔ زبردست اور بقائے دوام ضابطہ ہیں اِس سے زیادہ زمانہ کا بدیہی کشف اور قابلِ تسلیم معجزہ کیا ہو سکتا ہے۔ کہ یہ سب کچھ ایک شخصی طاقت کے دل ودماغ اور عقل کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ یہ شخصی جدوجہد تھی۔ مگر لازوال اور جن میں قوموں کی یگانگت اور نسل انسانی کے عالمگیر اتحاد اور یکجہتی کی عملی ہدایات و تعلیمات وسیع پیمانہ پر ہیں۔ اور جن کے نتائج ہمارے دل اور ضمیر کے سامنے صاف صاف نظر آرہے ہیں۔

ہندو مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ کہ جس کی تہ میں ہندوستان کی حقیقی اور حسب دلخواہ پولیٹیکل ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس اہم اور واجب العمل مسئلہ پر سرسید کے بہت سارے مقولے ہیں۔ جو کتاب ہذا میں بعنوان ہندو مسلمانوں کا باہمی اتحاد کے درج کئے گئے ہیں۔

فہرست مضامین مقالات سید

LIBRARY
AUG 18 1970
UNIVERSITY OF TORONTO

PK
2199
A4 A16
1914

یہ کتاب تمہیں قومی ہمدردی۔ ملکی بہبودی۔ آزادی اور آزادئ رائے
حب الوطنی۔ فائدہ عام۔ صداقت۔ ذاتی ایثار۔ باہمی اتحاد۔ اخلاق و نیکی
تعلیم و تربیت۔ تمدن و معاشرت کے پاک و اعلیٰ اصول بتاتی اور سکھاتی ہے

یک محبِ وطن کی واجب العمل اور پُرتاثیر ہدایات اور تعلیمات

یا

مقالاتِ سرسید

جنکو

شیخ ضیاء الحق سابق اڈیٹر پیشوا

نے

دالدولہ۔ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خان (غفرلہ) ۱۳۱۵ھ کی
تصنیفوں لیکچروں تقریروں اور مضامین سے انتخاب کرکے

کشمیری پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

سنہ ۱۹۱۴ء

للعم

(قیمت فی جلد ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک)

Ahmad Khan, (Sir) Syed

Ek muḥibb-i vaṭan
kī vājibul ʻamal
aur pur tāṡīr hidāyat
aur taʻlīmāt

Idarah - i Adabiyat - i Delli
2009, Qasim Jan St.,
Delhi-6 (India)

PK 2199 A4A16 1914

Ahmad Khan, (Sir) Syed
Ek muhibb-i vatan ki vajibul 'amal aur pur tasir hidayat aur ta 'limat

PLEASE DO NOT REMOVE
CARDS OR SLIPS FROM THIS POCKET

UNIVERSITY OF TORONTO LIBRARY